طلوعِ اسلام

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ
ہندستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

بدلِ اشتراک ہندستان اور پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے، غیر ممالک سے ۱۴ شلنگ

ٹیلیفون نمبر: ۳۴۲۸۸
خط و کتابت کا پتہ: بی ۳۰/۱۵۹، پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹

جلد ۹ | اگست سنہ ۱۹۵۶ء | نمبر ۷

فہرست مضامین

۱۴ اگست کا پیغام		۲
لمعات		۳ — ۱۶
سلیم کے نام	(محترم پرویز صاحب)	۱۷ — ۲۹
قرآنی معاشرہ	(محترم عمر احمد عثمانی صاحب)	۳۰ — ۴۰
اسلام کی سرگذشت		۴۱ — ۴۸
مجلسِ اقبال		۴۹ — ۵۴
احکام کی تبدیلی	(محترم علامہ صبحی محمصانی)	۵۵ — ۶۹
طلوعِ اسلام کنونشن		۷۰
اسکیم پیشگی خریداران		۷۱
اشتہارات		۷۲ — ۸۰

۱۴ اگست کا پیغام

اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۚ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا. (۱۷/۱۴)

تو اپنا اعمالنامہ پڑھ۔ آج تیری اپنی ذات خود تیرے خلاف محاسبہ کے لئے کافی ہے۔

ہم ۱۴ اگست کو جشن مسرت منانے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ دن جشن منانے کا نہیں بلکہ اپنا محاسبہ کرنے کا ہے۔ جب ہم اپنا محاسبہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ چیز اپنے اعمالنامہ کے ایک ایک صفحہ پر ابھرے ہوئے حروف میں لکھی ملتی ہے کہ ہمارے معاشرے کی خرابیاں اس حد تک پہنچ چکی ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص ان کے علاج کی طرف سے مایوس ہو چکا ہے۔ یاد رکھیئے! کسی قوم پر مایوسی طاری ہو جانا بڑی خطرناک علامت ہے۔

مایوسی کا نفسیاتی تجزیہ یہ ہے کہ جب آدمی دیکھتا ہے کہ وہ کچھ نہیں ہو رہا جو کچھ وہ چاہتا ہے تو اسے غصہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ جب وہ بے بسی میں خود اپنی ذات کے خلاف غصہ نکالتا ہے تو اس سے افسردگی اور اندوہناکی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی انتہائی شکل خودکشی ہے۔ جب وہ اس چیز کے خلاف غصہ نکالے جو اس کی مایوسی کا باعث ہو، تو اسے انتقام کہتے ہیں۔ اس سے سرکشی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اور جب وہ ایسا نہ کر سکے۔ تو غیر متعلقہ چیزوں کے خلاف غصہ نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ پاگل پن کی ابتدا ہوتی ہے آپ دیکھیں گے کہ اس وقت پاکستان میں بالعموم یہی کچھ ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ مغموم لہٰذا غیر متعلق ہو بیٹھے ہیں۔ کچھ سرکش ہو رہے ہیں۔ کچھ پاگل۔ ایسی صورت حالات کو زیادہ دیر تک جاری رہنے دینا انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔

پاکستان کی نگاہیں کسی ایسے مردِ مومن کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ جو اس کی مایوسی کو امیدوں میں بدل دے۔ ایسا وہی کر سکے گا جو قرآن کو ہاتھ میں لے کر اٹھے گا۔ اور دل کے پورے یقین کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت آواز دے گا کہ

لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ

ہمیں یقین ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

لمعات

حکومت پاکستان نے جو عائلی کمیشن (میرج کمیشن) مقرر کیا تھا، اس کی طرف سے شائع شدہ سوالنامہ اور اس کے جوابات طلوع اسلام بابت ماہ مئی ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب اس کمیشن کی رپورٹ بھی (حکومتِ پاکستان کے غیر معمولی گزٹ مجریہ ۲۰ جون ۱۹۵۶ء میں) شائع ہو گئی ہے۔ یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ اس ضمن میں ہم نے جو تجاویز پیش کی تھیں، کمیشن نے ان میں سے بیشتر سے اتفاق کیا ہے اور انھیں اپنی سفارشات میں شامل کر لیا ہے۔ ہماری یہ تجاویز قرآن کریم کی تعلیم پر مبنی تھیں اس لئے کمیشن اس حد تک مستحقِ تبریک و تہنیت ہے کہ اس نے ان قرآنی مشوروں کو قبول کر کے اپنی وسعتِ ظرف اور بلند نگہی کا ثبوت دیا ہے بعض سفارشات میں کمیشن نے اپنے آپ کو قرآنی تعلیم و قدامت پرستی کے بین بین رکھا ہے۔ اگر انھوں نے یہ روش اس لئے اختیار کی ہے کہ وہ مروجہ غیر قرآنی مسالک سے، قرآنی احکام تک، بتدریج آنے کو زیادہ مناسب سمجھتے ہیں تو انھیں چاہیئے تھا کہ اپنی رپورٹ میں اس پوزیشن کو واضح کر دیتے۔ ان امور کے متعلق جو کچھ رپورٹ میں کہا گیا ہے اور جس انداز سے کہا گیا ہے۔ وہ دلوں پر یہی اثر چھوڑتا ہے کہ اراکین کمیشن قدامت پرست حلقہ کے پروپیگنڈے سے خائف ہیں۔ اس لئے ایسے انقلابی (یعنی قرآنی) اقدام کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے۔ تاہم ہمہ کمیشن نے جس حد تک بھی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ ہمارے نزدیک درخورِ ستائش ہے کہ اس زمانہ میں اتنا کچھ بھی غنیمت میں سے ہے۔ ان کی سفارشات سے یہ اصول تو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہمارے مروجہ شرعی قوانین میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے صدیوں کے جمود و تعطل کی تاریخ میں یہ اقدام یقیناً درخورِ تحسین قرار پائے گا۔

کمیشن نے سفارشات کے علاوہ، اپنی رپورٹ میں ایک طویل تمہید لکھی ہے۔ اور آخر میں ان اصولوں کو پھر دہرا دیا ہے جن کی روشنی میں وہ ان سفارشات تک پہنچے ہیں۔ رپورٹ کے اس حصہ کو سرسری نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدامت پرستی کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ لیکن اس کا بامعان مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک عجیب قسم کی نفسیاتی کشمکش اور ذہنی انتشار (CONFUSION) کی غمازی کرتی ہے اس سے نظر آتا ہے کہ اگر کمیشن کو اصلاحِ حالات کا جذبہ صحیح راستہ پر ایک قدم آگے بڑھانے کی دعوت دیتا ہے تو جمہور کے معتقدات و مسالک سے ہٹ جانے کا خدشہ انھیں دو قدم پیچھے چلے جانے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ رپورٹ کا یہ حصہ "ایمان مجھے کھینچے ہے تو روکے ہے مجھے کفر" کی بزرخی حالت کا آئینہ دار ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر کمیشن اپنے آپ کو سفارشات تک ہی محدود رکھتا۔ اور دین میں قانون سازی کی اس

اصولی بحث میں نہ الجھتا تو ان کے لئے زیادہ بہتر ہوتا۔ اور اگر ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ تو رپورٹ کے اس حصہ کو زیادہ جرأت اور وضاحت سے لکھا جاتا۔ ذیل کی تصریحات اس نقطہ کی وضاحت کریں گی۔

مسلمانوں کی نکبت و زبوں حالی پر گفتگو کرتے ہوئے رپورٹ میں مذکور ہے کہ:۔

مسلمانوں کی اس عالمگیر پستی کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی اہمیت کا احساس نہیں رکھتے اور جو نئے نئے عناصر ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ ان کا سامنا نہیں کرتے (مثلاً) آجر اور اجیر، زمیندار اور کاشتکار سرمایہ دار اور مزدور۔ مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں انسانی ذہنیت میں نمایاں فرق آچکا ہے اور آتا جا رہا ہے۔ اس تبدیلی کا تقاضا ہے کہ ان مسائل پر از سر نو غور کیا جائے۔ باہمی معاملات کے لئے نئے نئے قواعد و ضوابط مرتب کئے جائیں۔ زندگی کے قریب قریب ہر گوشے کے لئے نئے قوانین بنائے جائیں۔ اور اپنے آئینی اور قانونی طریق کار کو نئے قالب میں ڈھالا جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ دنیا تو اس طرح صبح و شام بدلتی جائے۔ اور ایک قوم محض تماشائیوں کی طرح ان تبدیلیوں کو دیکھتی رہے (اب حالات یکسر دگرگوں ہو چکے ہیں) اب کوئی قوم خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے غیر متاثر اور غیر جانبدار نہیں رہ سکتی۔ اب یا تو اس قوم کو اپنی کشتی کو نہایت چابکدستی اور ہنرکاری سے متعین ساحل کی طرف لے جانا ہوگا۔ اور یا زمانہ کی تیز رو میں بہہ جانا اور بالآخر ڈوب جانا ہوگا۔ (ص ۱۲۰۲)

طائیت کے متعلق لکھتے ہیں:۔

جس طرح اسلام کسی ایسے بادشاہ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا جو غلطیوں سے معصوم اور قانون کی حد سے باہر ہو اسی طرح وہ مذہبی پیشواؤں کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتا (اس میں شبہ نہیں کہ) بعض افراد کو اسلامی قوانین کا علم دوسروں کی نسبت زیادہ ہوگا۔ لیکن اس سے ان کا کوئی الگ گروہ نہیں بن جاتا۔ نہ ہی انہیں کوئی خاص امتیازات حاصل ہو جاتے ہیں یا خاص مراعات مل سکتی ہیں (ص ۱۲۰۲)۔۔۔۔۔ قانون کا تعلق انجام کار زندگی کے تجارب سے ہے۔ جس پر صرف ارباب مذہب کی اجارہ داری نہیں (ص ۱۲۰۵)

موجودہ فقہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

مشہور ائمہ فقہ کے ضوابط قوانین کے متعلق کمیشن کا خیال ہے کہ انہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو سہو و خطا سے مبرا تصور نہیں کیا۔ (ص ۱۲۰۹)

اس کے بعد انہوں نے اس اہم اصول کو بیان کیا ہے کہ

حقیقت غیر متبدل اور قابل تغیر و تبدل کے امتزاج کا نام ہے۔ (ص)

اس اصول کی روشنی میں انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ دین میں غیر متبدل کیا ہے۔ اور قابل تغیر و تبدل کیا ۔۔۔ تحریر ہے۔

انسانی تعلقات کے وہ بنیادی اصول جو قرآن نے دیئے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور واجب التسلیم ہیں۔ لیکن ان اصولوں کے اطلاق کی شکلیں اور ان کے نفاذ پذیر ہونے کی صورتیں زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہنی چاہئیں۔ (ص ۱۲۲۹)

یہاں تک بات بالکل واضح ہے۔ اور یہ وہی مسلک ہے جس کی طرف طلوعِ اسلام مسلسل دعوت دیتا چلا آرہا ہے۔ حتیٰ کہ کمیشن نے اپنی رپورٹ کا خاتمہ جن الفاظ پر کیا ہے۔ وہ اس موضوع پر فی الواقعہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رپورٹ کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں وہ سوال جو عنقریب تمام اسلامی ممالک کے سامنے آئے گا یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب کے لئے بڑی فکری جدوجہد کی ضرورت ہوگی (اگر اس کے لئے اس طرح جدوجہد کی گئی تو) اس کا جواب یقیناً اثبات میں ملے گا۔ بشرطیکہ عالمِ اسلامی نے (حضرت عمرؓ) کی نوع کو سامنے رکھ کر اس کا جواب تلاش کیا ـــــ وہ (حضرت) عمرؓ جو اسلام میں سب سے پہلا تنقیدی اور آزاد ذہن لے کر آئے تھے۔ جن میں اس قدر اخلاقی جرأت تھی کہ انھوں نے رسول اللہؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں حسبنا کتاب اللہ کے جید الفاظ ارشاد فرمائے۔

خدا کرے کہ پاکستان کی اسلامی جمہوریہ، اسلام کی اصلی، ذی حرکت، وسیع النظر اور تخلیقی روح کی طرف لوٹ کر اپنے نام کی لاج رکھ لے۔ (ص ۱۲۳۲)

یہ اعلانات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ کمیشن کے نزدیک۔

(۱) قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو تمام نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کافی ہے۔

(۲) قرآن میں یہ راہ نمائی اصولی طور پر دی گئی ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں جو جزئیات متعین ہوں گی۔ ان میں زمانے کے تغیرات کے ساتھ مناسب ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اس کے بعد اسی رپورٹ میں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو قرآن کی اس حقیقی پوزیشن کے یکسر منافی ہیں۔ مثلاً (ص ۱۱۹۹ پر) درج ہے کہ

جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے اس میں صرف ان احکام و قوانین کا بیان ہے۔ جو زندگی کے بنیادی اصولوں اور اہم معاملات سے متعلق ہیں۔ اور جو ان سوالات کے جوابات پر مشتمل ہیں جو اس زمانے میں سامنے آئے جب قرآن نازل ہو رہا تھا۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ کمیشن کے نزدیک قرآن میں صرف ان امور کے متعلق راہ نمائی مل سکتی ہے۔ جو زمانۂ نزول قرآن میں سامنے آئے۔ اگر نزول قرآن کا عرصہ لمبا ہو جاتا۔ اور اس طرح اور سوالات بھی سامنے آجاتے تو قرآن میں مزید راہ نمائی مل جاتی۔ اس خیال کی تائید رپورٹ کے اس فقرے سے بھی ہوتی ہے۔ جو اس سے ذرا آگے چل کر لکھا گیا ہے۔ یعنی

اگرچہ نبی اکرمؐ کے زمانہ میں عربوں کی زندگی میں پرانے زمانے کی سادگی تھی۔ لیکن حضورؐ کی نبوی بصیرت اس

حقیقت سے آشنا تھی کہ ایسے معاملات اور واقعات بھی پیش آسکتے ہیں۔ جو قرآن میں واضح طور پر سامنے نہیں آسکے (NOT CLEARLY ENVISAGED IN QURAN)

اس قسم کا تصور ایک انسانی تصنیف کے متعلق تو کیا جا سکتا ہے کیونکہ انسان صرف اپنے پیش نظر حالات و حوادث کے متعلق ہی کچھ کہہ سکتا ہے وہ آنے والے واقعات اور حالات کا علم نہیں رکھتا۔ لیکن خدا کے متعلق اس قسم کا تصور یکسر باطل ہے۔ خدا کے سامنے حاضر و غیب۔ دونوں حالات و واقعات ہوتے ہیں۔ اس لئے قرآن کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں صرف انہی حالات کے متعلق اصولی قوانین دیئے جا سکتے تھے جو زمانہ نزول قرآن میں سامنے آئے تھے۔ اور وہ بعد میں آنیوالے حالات کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ خدا کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے سے انکار کے مترادف ہے۔ قرآن کے متعلق صحیح تصور یہ ہے کہ اس میں ان تمام تقاضوں کے لئے اصولی راہ نمائی دیدی گئی ہے۔ جو نوع انسانی کو قیامت تک پیش آنے والے ہیں (ختم نبوت کا یہی عملی مفہوم ہے) البتہ ان اصولوں کی جزئیات کا تعین بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ بدلنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ زندگی کا کوئی تقاضا ایسا نہیں جس کے متعلق قرآن میں اصولی ہدایت موجود نہ ہو۔ اس لئے کہ خدا کے نزدیک زمانۂ نزول قرآن اور اس کے بعد قیامت تک کا زمانہ یکساں حیثیت رکھتا ہے ختم نبوت کی دلیل ہی یہ ہے کہ قرآن کریم میں انسانی زندگی کے تمام تقاضوں سے متعلق راہ نمائی آچکی ہے۔ اور اس طرح دین مکمل ہو چکا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ کمیشن کے رپورٹ کے الفاظ ذہن میں یہ تصور پیدا کرتے ہیں کہ دین ناقص رہ گیا ہے۔ اور قرآن میں انسانی زندگی کے لئے مکمل راہ نمائی موجود نہیں ہے۔

اسی طرح رپورٹ کے آخر میں لکھا ہے کہ۔

جب قرآن نازل ہو رہا تھا تو حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ احکام میں بھی ردوبدل ہوتا رہتا تھا (صفحہ ۱۲۳)

یہ الفاظ بھی قرآن کے متعلق بہت بڑی غلط فہمی پیدا کرنے کا موجب ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ کمیشن کے نزدیک

(۱) قرآن کے ابتدائی احکام بعد میں آنے والے احکام سے منسوخ ہو جاتے تھے۔

(۲) قرآن کے نزول کا زمانہ صرف تیئس سال رہا اس لئے اس تیئس سال کے عرصہ میں قرآنی احکام میں تنسیخ و تبدل کا یہ عمل رہا۔ اگر نزول قرآن کا عرصہ اور لمبا ہوتا تو زمانہ کے تقاضوں کی تبدیلی سے بعض اور احکام بھی تبدیل ہو جاتے۔

(۳) زمانۂ نزول قرآن کے بعد اس وقت تک زمانے کے بیشتر تقاضے بدل چکے ہیں۔ اس لئے قرآن کے بیشتر احکام ایسے ہیں جن میں ردوبدل ہونا ضروری ہے۔

ہم ارباب کمیشن سے باادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا قرآن کے متعلق ان کا یہی عقیدہ ہے؟ اگر یہی عقیدہ ہے تو وہ اندازہ لگائیں کہ وہ قرآن کے متعلق دنیا کے سامنے کیا تصور پیش کر رہے ہیں۔ اور اگر ان کا یہ عقیدہ نہیں تو یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اپنی رپورٹ کے ان حصوں میں مناسب تبدیلی کر دیں۔ رپورٹ کے یہ حصے اپنی موجودہ شکل میں بڑے گمراہ کن ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کے احکام تدریجاً نازل ہوتے تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حالات کے بدلنے سے احکام میں تبدیلی ہو جاتی تھی۔ قرآن کے نزول کے آغاز ہی سے خدا کے سامنے انسانی معاشرے کا پورا نقشہ تھا۔ اس نے اپنے احکام اس طرح نازل کئے کہ یہ معاشرہ تدریجاً آخری منزل تک پہنچ گیا لیکن

اس کا یہ مطلب نہیں کہ عبوری دور سے متعلق احکام آخری احکام سے منسوخ ہو گئے۔ وہ احکام اب بھی اسی طرح واجب العمل ہیں یعنی اگر ہم آج چاہیں کہ اپنے معاشرے کو قرآنی قالب میں ڈھال لیں تو ہم آغاز کار انہی عبوری دور کے احکام سے کریں گے۔ اور اس طرح منزل بہ منزل آخری نقطہ تک پہنچ جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ احکام منسوخ نہیں ہوئے۔ قرآن کا کوئی حکم بھی منسوخ نہیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کمیشن کا دعوے یہ تھا کہ غیر متبدل اصول صرف قرآن کے اندر ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مرتب کردہ جزئیات میں زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ردوبدل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس دعوے کے بعد وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ دین میں سند کتاب و سنت ہے۔ جس سے مطلب یہی ہے کہ اس باب میں سنت رسول اللہؐ کی بھی وہی حیثیت ہے۔ جو کتاب کی ہے۔ یعنی جو جزئیات احادیث میں ملتی ہیں۔ ان میں بھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اس اعلان سے وہ اپنے پہلے مسلک سے خود ہی ہٹ گئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ (قرآن کی طرح) سنت رسول اللہؐ میں بھی صرف انہی واقعات کے متعلق احکام ملتے ہیں جو نبی اکرمؐ کی زندگی میں سامنے آ سکے تھے۔ اس ضمن میں رپورٹ میں تحریر ہے کہ:۔

> رسول اللہ کا منصب یہ تھا کہ وہ قرآن کے ان اصولی احکام کی تبیین و وضاحت اور تشریح کریں اور جو واقعات حضورؐ کی زندگی میں سامنے آئے تھے۔ ان پر ان اصولوں کا عملی اطلاق کر کے دکھائیں۔ حضورؐ کے ان ارشادات عملی نمونہ اور ان احکام کی تفسیر و تعبیر کا نام سنت ہے۔ چونکہ کوئی شخص بھی انسانی زندگی کے تمام معاملات کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے رسول اللہ نے بہت سے گوشے ایسے چھوڑ دیئے۔ جن میں حضورؐ کے صحابہؓ کو قرآن و سنت کی روشنی میں قانون سازی کی آزادی حاصل تھی۔ کتاب و سنت کی حدود کے اندر اس انداز کی قانون سازی کو اجتہاد کہتے ہیں۔ (صفحہ ۱۱۹۹)

ذرا آگے چل کر اسی نظریہ کی وضاحت میں کہا گیا ہے کہ:۔

> رسول اللہؐ بھی یہ جانتے تھے کہ آپ کی تبیین و تعبیر بھی نہ تمام حالات و واقعات کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اور نہ ہی نئے نئے حوادث کو محیط ہو سکتی ہے۔ اس لئے آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جن معاملات میں قرآن و سنت میں کوئی راہنمائی نہ ملے ان میں وہ ذاتی اجتہاد سے کام لیں۔ (صفحہ ۱۱۹۹)

جہاں تک "کتاب و سنت" کا تعلق ہے جماعت قدامت پرست طبقہ میں دو گروہ ہیں۔ پہلے گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کے متعلق کتاب و سنت میں جزئی احکام تک موجود نہ ہوں۔ اس لئے کوئی ایسا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ جس میں کسی کے ذاتی اجتہاد کی ضرورت لاحق ہو۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسے معاملات ہو سکتے ہیں جن کے متعلق کتاب و سنت میں واضح احکام نہ ملیں، ان معاملات میں کتاب و سنت کی روشنی میں نئے قوانین بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ اس عقیدہ میں بہرحال مشترک ہیں کہ کتاب و سنت میں جو احکام موجود ہیں۔ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔ کمیشن نے (اپنی رپورٹ کے مندرجہ بالا اقتباسات کی رو سے) جو مسلک اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم میں تمام آنے والے حالات وواقعات کے متعلق راہنمائی موجود نہیں۔

(۲) اسی طرح سنت رسول اللہ میں بھی تمام حالات وواقعات کے متعلق جزئیات موجود نہیں۔

(۳) لہذا ان معاملات کے بارے میں جن کے متعلق کتاب وسنت خاموش ہے۔ ہم اپنے اجتہاد سے قانون بنا سکتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ کمیشن نے اپنی رپورٹ کے ان چند صفحات میں کس قدر پلٹے لئے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ہم نے کہا کہ کمیشن کے لئے بہتر ہوتا کہ وہ قانون سازی کی اس اصولی بحث میں الجھے بغیر اپنی سفارشات پیش کر دیتے۔ اس بحث میں انہی لوگوں کو حصہ لینا چاہیئے۔ جو دین میں قانون سازی کے سوال کے متعلق اپنے سامنے واضح اور متعین تصور رکھتے ہوں۔ اور پھر اس تصور کے علی الاعلان بیان کر دینے کی جرأت اپنے اندر پاتے ہوں۔ کمیشن کی رپورٹ اس حقیقت کی مظہر ہے کہ اس باب میں یا تو ان حضرات کے ذہن میں کوئی واضح اور متعین تصور نہیں یا وہ اس تصور کو کھلے کھلے الفاظ میں بیان کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اس اہم اور بنیادی سوال کے متعلق کمیشن کی رپورٹ میں

منکرے بودن وہم رنگِ مستاں زیستن

کا بعینہٖ وہی مسلک اختیار کیا گیا ہے جو (کمیشن کے سکریٹری خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے) مجلۂ ثقافت کا مسلک ہے کہ۔ باما شراب خورد و بزاہد نماز کرد۔ کمیشن کی اس (دانستہ یا نادانستہ) روش کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ملّا کے پروپیگنڈے کا بھی ہدف بنے ہوئے ہے۔ اور بارگاہ خداوندی سے اسے حسبنا کتاب اللہ کے دعوے کا سارٹیفکیٹ بھی نہیں مل سکتا۔ اس قسم کی پالیسی کا ہمیشہ ایسا ہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲/۸۵) کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ کتاب اللہ کی بعض باتوں کو مانو اور بعض سے انکار کر دو۔ یاد رکھو! جو بھی تم میں سے ایسا کرے گا۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوگا۔ اور قیامت کے دن اس سے بھی شدید عذاب کی طرف لوٹایا جائیگا۔ اس لئے کہ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ قرآن "شرکت میانہ حق و باطل" کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اس باب میں وہ بڑا غیور واقع ہوا ہے۔ اور حق کو ایسا ہونا ہی چاہیئے۔

اس کمیشن کے ممبر حسب ذیل حضرات تھے۔

(۱) ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین (صدر)

ان کی وفات کے بعد پاکستان کے سابق چیف جسٹس میاں عبدالرشید صاحب صدر مقرر ہوئے۔

(۲) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (ممبر۔ سکریٹری)

(۳) احتشام الحق صاحب

(۴) عنایت الرحمٰن صاحب (ڈھاکہ) انہوں نے کمیشن کے کسی اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ لیکن کمیشن کی مرتبہ رپورٹ کی توثیق کر دی ہے

(۵) بیگم شاہنواز صاحبہ

(۶) بیگم انور جی احمد صاحبہ

(۷) بیگم شمس النہار محمود صاحبہ

زیر نظر رپورٹ کمیشن کے ممبروں کی متفقہ علیہ ہے۔ البتہ احتشام الحق صاحب نے کوئی اختلافی نوٹ لکھا ہے۔ جو رپورٹ کے ساتھ شائع نہیں ہوا اور نہ ہی (ان سطور کی تحریر کے وقت تک) وہ نوٹ علیحدہ شائع ہو کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ کمیشن کی اہم سفارشات کا اجمالی تعارف حسب ذیل ہے۔

نکاح

(۱) کسی سرکاری نکاح خواں کی ضرورت نہیں۔ نکاح نامہ کا فارم حکومت کی طرف سے شائع کیا جائے۔ اور نکاح خواں کا فرض ہو کہ اسے تحصیلدار کے دفتر میں رجسٹر کرائے (یہ سفارشات طلوع اسلام کی تجاویز کے مطابق ہیں)

(۲) اٹھارہ سال سے کم عمر کے لڑکے اور سولہ سال سے کم عمر لڑکی کا نکاح جائز نہ قرار دیا جائے۔ کیونکہ قرآن نے معاہدات کے لئے بلوغت اور رُشد کو شرط قرار دیا ہے (طلوع اسلام نے ایسا ہی کہا تھا) احتشام الحق صاحب نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

طلاق

طلاق کے متعلق کمیشن نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کا ذہنی انتشار (CONFUSION) بری طرح عیاں ہے۔ ان کی سفارشات کا ملخص حسب ذیل ہے۔

(ا) ایک نشست میں تین بار طلاق کہہ دینے کو ایک ہی طلاق شمار کیا جائے۔

(ب) طلاق تین طُہروں میں تین بار دی جائے۔

(ج) ایک معیاری طلاق نامہ مرتب کیا جائے۔ جس کا تحصیلدار کے ہاں رجسٹری کرانا ضروری ہو۔

(د) طلاق صرف بذریعہ عدالت دی جا سکے۔ عدالت پہلے ثالثوں کے ذریعہ باہمی مصالحت کی کوشش کرے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب طلاق کا فیصلہ عدالت کرے گی تو پھر ایک نشست میں تین بار طلاق یا تین الگ الگ نشستوں میں طلاق کا سوال ہی کیسے پیدا ہوگا۔ یہ بھی واضح ہے کہ ان سفارشات میں شق (ا) اور (ب) قرآن کے خلاف ہے اور شق (د) مروجہ قانون کے خلاف قرآن کی رُو سے (ایک بار یا تین بار کی) طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طلاق کے لئے (انفرادی افہام و تفہیم کے بعد) معاملہ مصالحتی مجلس کی طرف جاتا ہے۔ اگر وہ مجلس اپنی کوششوں میں ناکام رہے تو وہ اپنی رپورٹ عدالت کی طرف بھیج دیتی ہے۔ اس کے بعد

عدالت میاں بیوی کی علیحدگی کا فیصلہ صادر کرتی ہے۔ اسی کو طلاق کہتے ہیں۔ اگر یہ میاں بیوی چاہیں تو اس طلاق کے بعد بھی تجدید نکاح سے ازدواجی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اگر پھر اسی طرح طلاق کی نوبت پہنچ جائے تو اسے دوسری مرتبہ طلاق کہا جائے گا جس کے بعد پھر ازدواجی زندگی کی تجدید کی اجازت ہوگی۔ لیکن اگر اسی طرح تیسری مرتبہ بھی طلاق ہو گئی تو پھر انہیں تجدید نکاح کی اجازت نہیں ہوگی۔ البتہ اگر یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرلے۔ اور وہ بھی اسے طلاق دیدے تو وہ پھر پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کا یہ حکم کس قدر صاف اور واضح ہے۔ لیکن کمیشن نے اس سیدھی سی بات کو الجھاؤ میں ڈال دیا ہے۔ جس سے نہ خلق راضی ہوا ہے نہ خدا۔

اسی طرح عورت کے حقِ طلاق کے سلسلہ میں بھی کمیشن نے فقہی قانون ہی کا اتباع کیا ہے۔ قرآن کی تعلیم کا نہیں۔ قرآن کی رو سے عورت کو بھی (بذریعہ عدالت) اسی طرح معاہدۂ نکاح فسخ کرا لینے کا حق حاصل ہے جس طرح مرد کو۔ (اس کے لئے عورت کو (مرد کے مطالبہ پر) اپنے مہر میں سے کچھ چھوڑنا پڑتا ہے) لیکن کمیشن کی سفارش یہ ہے کہ اگر مرد نکاح نامہ میں حقِ طلاق عورت کو تفویض کردے تو پھر عورت طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ اگر وہ ایسا حق تفویض نہ کرے تو پھر عورت کا چھٹکارا ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ تصور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ تفویض کی صورت میں بھی کمیشن کی سفارش کے مطابق میاں اور بیوی کے مزاج کی عدم موافقت، طلاق کی معقول وجہ قرار نہیں پا سکتی۔ حالانکہ خود رپورٹ میں لکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے مزاج کے عدم موافقت کی بنا پر ایک عورت کو طلاق دلوائی تھی گو کمیشن کی یہ سفارش نہ صرف قرآن کے خلاف ہے بلکہ سنت رسول اللہ کے بھی خلاف ہے۔

تعددِ ازدواج

تعددِ ازدواج کے سلسلہ میں رپورٹ کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے

> قرآن میں تعدد ازدواج کے متعلق صرف ایک آیت ہے یہ آیت بعض ایسی مشکلات کے حل کے لئے نازل ہوئی تھی۔ جو یتیم لڑکیوں اور بیواؤں کے سلسلہ میں پیدا ہو گئی تھیں۔ لہٰذا ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت عدلِ عمرانی کے ضمن میں دی گئی تھی۔ اس آیت کی رو سے اس امر کا خدشہ تھا کہ یتیم لڑکیوں اور بیوہ عورتوں سے عادلانہ برتاؤ نہیں ہوگا۔ اس کے لئے قرآن نے محض ایک ہنگامی صورت حالات کے علاج کے طور پر مسلمانوں کو اجازت دی تھی کہ وہ ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کر لیں۔ (صفحہ ۱۲۱)

اس سے ظاہر ہے کہ کمیشن کو یہ تسلیم ہے کہ قرآن نے محض ایک ہنگامی حالت پر قابو پانے کے لئے تعدد ازدواج کی اجازت دی تھی۔ اگر یہ ہنگامی حالت پیدا نہ ہو تو پھر قرآن کی رو سے ایک ہی بیوی رہنی چاہیئے۔ اس کے بعد کمیشن نے سفارش کی ہے کہ

> جو شخص دوسری شادی کرنا چاہے۔ اس کے لئے ضروری قرار دیا جائے کہ وہ عدالت میں جائے اور ان وجوہات کو بیان کرے جن کی بناء پر اس کے لئے دوسری شادی ضروری ہو گئی ہے۔ . . . .

(مثلاً یہ کہ) اسکی پہلی بیوی پاگل ہوگئی ہے۔ یا کسی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہے۔ یا ایسے مخصوص حالات پیدا ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے اس کے لئے دوسری شادی ناگزیر ہوگئی ہے۔ (ص ۱۲۱۶)

آپ غور کیجئے کہ کمیشن کو خود تسلیم ہے کہ قرآن نے تعدد ازدواج کے لئے ایک اور صرف ایک صورت بتائی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر معاشرے میں کسی وقت ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ غیر شادی شدہ لڑکیوں اور بیواؤں کی تعداد زیادہ ہو جائے۔ اور اس طرح معاشرہ کے عمرانی توازن کے بگڑنے کا خطرہ لاحق ہو جائے تو اس شکل کے حل کے لئے تعدد ازدواج کو اجتماعی طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تعدد ازدواج کی اجازت صرف اس شرط کے ساتھ دی تھی۔ لیکن کمیشن اس صورت حالات کو تسلیم کرنے کے باوجود دوسری شادی کے لئے انفرادی طور پر اور وجوہات بھی تجویز کر رہا ہے۔ یہ چیز قرآن پر اضافہ ہے جس کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ تعدد ازدواج کے متعلق قرآن کی آیت یہ ہے

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (۴/۳)

اس میں دو شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یتیم لڑکیوں اور بے شوہر عورتوں کا مسئلہ منصفانہ طور پر حل نہ ہو رہا ہو۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ ان حالات میں جو شخص ایک سے زیادہ شادی کرے وہ عدل کر سکتا ہو۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوگی تو تعدد ازدواج کی اجازت ساقط ہو جائے گی۔ لیکن ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے کہ عدل کی شرط کو تو ہر شخص لازمی مانتا ہے لیکن پہلی شرط کا کوئی ذکر تک نہیں کرتا۔ اور چار بیویوں تک کی اجازت کو تمام حالات میں جائز سمجھتا ہے۔ یہی روش کمیشن نے اختیار کی ہے۔ وہ بھی عدل کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اور اس کے لئے سفارش کرتا ہے کہ عدالت اس امر کا اطمینان کرلے کہ جو شخص دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ دونوں بیویوں کی کفالت کر سکے گا۔ لیکن پہلی شرط کو وہ بھی لازمی قرار نہیں دیتا بلکہ یہ سفارش کرتا ہے کہ بیوی کی بیماری یا اس قسم کے اور حالات میں بھی دوسری شادی کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ قرآن کی دو سادی شرطوں میں سے ایک شرط کو لازمی قرار دینا اور دوسری کو نظر انداز کر دینا کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے۔ یہ کسے حق پہنچتا ہے کہ قرآن نے جس بات کی اجازت کو ایک خاص شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ وہ اسے اس شرط کی عدم موجودگی میں بھی جائز قرار دے دے۔ یہ قرآن کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے جسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ہے قرآن کی رو سے تعدد ازدواج کی پوزیشن۔ ہمیں افسوس ہے کہ کمیشن نے قرآن کی آیت کو سامنے رکھنے کے باوجود ایسی تجویز پیش کر دی ہے جو قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ بایں ہمہ کمیشن نے جو یہ کہا ہے کہ دوسری شادی کے لئے عدالت کی اجازت ضروری قرار دیدی جائے۔ تو یہ تجویز موجودہ صورت حالات سے یقیناً بہتر ہے اور جب تک ہم قرآنی قوانین کے نافذ کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے اس قابل ہے کہ اسے اختیار کر لیا جائے۔

مہر

مہر کے متعلق کمیشن کی سفارشات طلوع اسلام میں پیش کردہ تجاویز کے مطابق ہیں۔ یعنی مہر ایک قرض ہے جسے خاوند کو بہرحال ادا کرنا ہوگا۔ اس کے لئے کسی مدت کے تعین کی ضرورت نہیں۔

یتیم پوتے کی وراثت

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ کمیشن نے طلوع اسلام کے پیش کردہ تصور سے اتفاق کیا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے محروم قرار نہیں پا سکتا۔ ہم کمیشن کی خدمت میں ان کے اس مبارک اقدام پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ متوقع تھا احتشام الحق صاحب نے کمیشن کی اس سفارش سے بھی اختلاف کیا ہے۔

وقف علی الاولاد

کمیشن نے طلوع اسلام کی اس تجویز سے بھی اتفاق کیا ہے کہ وقف علی الاولاد کا موجودہ قانون منسوخ کر دیا جائے۔

قید کی صورت میں

کمیشن نے طلوع اسلام کی اس تجویز سے بھی اتفاق کیا ہے کہ قیدیوں کو کچھ وقفہ کے بعد اپنے بیوی بچوں سے ملنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ اور ان کے بیوی بچوں کی کفالت کا بھی انتظام کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے کمیشن نے سفارش کی ہے کہ قیدی سے جو کام جیل خانہ میں لیا جائے۔ اس کی اجرت اس کے محتاج بیوی بچوں کو دی جائے۔

ازدواجی و عائلی عدالت

کمیشن نے طلوع اسلام کی ان تجاویز سے بھی اتفاق کیا ہے کہ عائلی مقدمات کی صورت میں کوئی کورٹ فیس نہ لگایا جائے۔ ان مقدمات کے فیصلے بلا تاخیر کئے جائیں۔ اور فریقین اپنے نمائندگان یا اقارب کی وساطت سے پیروی کر سکیں۔ اور وکلاء کی وساطت سے پیروی کی شرط اڑا دی جائے۔

یہ ہیں کمیشن کی موٹی موٹی سفارشات۔ ان میں سے ان سفارشات کو چھوڑ کر جن کے متعلق سطور بالا میں بتایا گیا ہے کہ وہ کس طرح قرآنی تعلیم و منشا کے خلاف ہیں، باقی سفارشات قرآن کے مطابق ہیں۔ اور اس قابل کہ انہیں بلا مزید تاخیر قانونی شکل دے کر ملک میں رائج کر دیا جائے۔ جو سفارشات قرآنی منشاء کے مطابق نہیں ان کے متعلق سمجھنے سوچنے والے طبقہ کو بار بار بتانے کی ضرورت ہے کہ صحیح قرآنی پوزیشن کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قرآنی فکر کو عام کرنے سے فکری صلاحیتیں رکھنے والا طبقہ قرآن سے قریب تر ہوتا جائے گا۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ

ہمارے غیر قرآنی قوانین قرآن کے مطابق بنتے چلے جائیں گے۔ طلوعِ اسلام نے اپنے سامنے یہی مقصدِ عظیم رکھا ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے یہی فکری طریقِ کار اختیار کیا ہے۔ وہ اپنی اس سعادت پر جس قدر بھی سجداتِ شکرانہ ادا کرے کم ہیں کہ اس نے اس تھوڑی سی مدت میں اپنی تمام بے بضاعتی کے باوجود جو جدّ وجہد کی ہے۔ اس کے خوشگوار نتائج آہستہ آہستہ سامنے آرہے ہیں وہ اسے اپنی سعی و کاوش کا کافی صلہ سمجھتا ہے۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔

جیسا کہ ظاہر ہے مولوی صاحبان کی طرف سے (حسبِ معمول) ان سفارشات کی مخالفت شروع ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ (اسی گروہ کے ایک نمائندے کے الفاظ میں) یہ ہے کہ

> اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ عادتِ قدیمہ کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں اور جب کوئی مجتہد حالات کے تغیر اور زمانے کی بدلی ہوئی ضروریات کو محسوس کر کے طریقۂ متوارثہ میں ترمیم کی جرأت کرتا ہے تو وہ محض اس بنا پر اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں کہ اس نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ان کی طبائع مانوس نہیں مگر جب یہ نیا طریقہ چل پڑتا ہے اور اجنبیت دور ہو جاتی ہے تو لوگ نہ صرف اس کو جائز بلکہ مفید سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے جب قرآن مجید کا ترجمہ فارسی میں کیا تو اسی بنا پر ان کی مخالفت کی گئی تھی۔ ان سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جس میں عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں دعا کرنا، وعظ کہنا اور دینی مسائل میں اظہارِ خیال کرنا ایک نئی چیز تھی۔ اور لوگ اس پر معترض ہوتے تھے۔ ترکی میں جب پہلی مرتبہ جدید طرزوں پر فوجوں کو مرتب کرنے اور نئے آلاتِ جنگ کا استعمال رائج کرنے کی کوشش کی گئی تو ایک جماعت نے اس پر سخت اعتراض کیا تھا۔ ان میں سے ہر موقع پر یہی کہا گیا کہ یہ بدعت اور احداث فی الدین ہے۔ مگر آج کوئی نہیں جس کو ان چیزوں پر اعتراض ہو۔ اعتراض تو در کنار آج عامی اور عالم سب ان کو جائز اور مستحسن سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ پر آپ غور کریں گے۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے اعتراضات در اصل غیر شرعی محرکات سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان کی تائید میں شریعت سے استدلال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۳۶۶۔ از ابوالاعلیٰ صاحب مودودی)

علماء کا جو طبقہ اس قسم کی مخالفت کرتا ہے۔ خود اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ

> وہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پا کر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے۔ وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۳۵۹)

باقی رہا اس طبقہ کا اندازِ مخالفت، سو اس باب میں کیفیت یہ ہے کہ

> اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا (صفحہ ۳۵۹)

کمیشن کی سفارشات کی یہ مخالفت سب سے زیادہ خود جماعتِ اسلامی کی طرف سے ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ ان کا تو مسلک ہی یہ ہے کہ اِدھر ان طبقہ میں مقبول ہونے کے لئے اس قسم کی باتیں کی جائیں جن کے اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں۔ اور عوام میں مقبول بننے کے لئے ان کی ہاں سے ہاں بھی ملائی جائے۔ مودودی صاحب تو آجکل پاکستان میں موجود نہیں۔ ان کے نائب امین احسن صاحب اصلاحی نے اپنی ایک تقریر میں (جو ۸ جولائی

کے پاکستان ٹائمز میں شائع ہوئی ہے، سب سے پہلے یہ اعتراض کیا ہے کہ آئینِ پاکستان کی رو سے کمیشن کو ان سفارشات کا حق ہی حاصل نہیں۔ حالانکہ جب مودودی صاحب نے کمیشن کے سوالنامہ کا جواب بھیجا ہے تو اس میں قطعاً یہ نہیں کہا گیا کہ تم اس قسم کی تحقیق و سفارشات کے مجاز نہیں ہو۔ اس کے بعد اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ

> یہ حقیقت ہر جگہ معروف و مسلّم ہے کہ کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی قوم کی ان رسومات میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے جن کا تعلق ان کی عائلی زندگی سے ہو۔ یہ اصول اس قدر مسلّم ہے کہ لادینی حکومتیں بھی ان مذہبی فرقوں کے شخصی قوانین و پرسنل لاز کا احترام کرنے پر مجبور ہیں جو ان کی حدود مملکت میں بستے ہوں۔ حتیٰ کہ بھارت کی حکومت نے بھی جو وہاں کے مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کا کوئی ذمہ نہیں لیتی، اپنے حالیہ قوانین دربارہ ازدواجی زندگی میں مسلمانوں کے پرسنل لا کو چھونے تک کی جرأت نہیں کی وہ جانتی تھی کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کس قدر خوں ریزی ہوگا۔

یعنی کسی ترمیم کے اچھے برے ہونے کا سوال تو در کنار، کسی حکومت کو کسی قوم کی شخصی رسومات میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کا حق حاصل نہیں اور ظاہر ہے کہ جب کسی حکومت کو اس قسم کی رسومات تک میں تغیر و تبدل کا حق نہیں تو ان کے شرعی معاملات میں تغیر و تبدل کا حق کس طرح پہنچ سکتا ہے! ہم اصلاحی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ان کے اس اصول کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں میں جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے اور شخصی معاملات سے متعلق جس قسم کے قوانین و رسومات ہمارے ہاں مروج ہیں۔ ان میں حکومت کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتی تو آئینِ پاکستان میں جو یہ شق رکھی گئی ہے کہ حکومت پاکستان ایک بورڈ بٹھائے گی جو مروجہ قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق بنانے کا کام کرے گا تو اس پر انہوں نے اعتراض کیوں نہیں کیا؟ جب یہ بورڈ ہمارے مروجہ قوانین کی چھان بین کرے گا تو جو قوانین کتاب و سنت کے خلاف نظر آئیں گے۔ وہ لامحالہ ان میں تغیر و تبدل کی سفارش کرے گا۔ ان میں شخصی قوانین بھی شامل ہوں گے۔ اگر اصلاحی صاحب کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو اس بورڈ کو شخصی قوانین کے بارے میں اس قسم کے تغیر و تبدل کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ یا للعجب! یہ بات تو پھر بھی ان قوانین کے متعلق ہے جو کتاب و سنت کے مطابق نہیں۔ اب سنئے کہ جماعتِ اسلامی کے امیر ان قوانین کے متعلق کیا فرماتے ہیں جو خود شارع نے متعین فرمائے تھے ان کا ارشاد ہے کہ

> یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے۔ لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں۔ ان کو بجنسہٖ تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی واسطہ نہیں (تفہیمات ۲۷،۲۸۔ ۳۲۴)

یعنی امیرِ جماعت تو فرماتے ہیں کہ حالات کے تقاضے سے ان قوانین میں بھی تغیر و تبدل ہو سکتا ہے جو خود شارع نے متعین فرمائے تھے[1] لیکن ان کے نائب کہ

---

[1] واضح رہے کہ طلوعِ اسلام کے یہی کچھ کہنے سے جماعتِ اسلامی اسے منکرِ حدیث اور منکرِ سنت قرار دے رہی ہے۔

میری نگاہِ شوق پر اس درجہ سختیاں　　اپنی نگاہِ ناز کی کچھ بھی خبر نہیں

ارشاد ہے کہ حکومت ان رسوم تک کو بھی بدل نہیں سکتی جو شخصی معاملات کے بارے میں کسی قوم میں مروج ہوں، لیکن ان کی یہ متضاد روش قطعاً قابل تعجب نہیں۔ ان کے ہاں ہر معاملہ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

اصلاحی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ازدواجی زندگی سے متعلق ہمارے مروجہ قانون وہ ہیں

> جنہیں تمام اکابر فقہا اور جمہور مسلمانوں نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ اور یہ اسی طرح سے اسلاف سے متوارث چلے آ رہے ہیں۔ (پاکستان ٹائمز، ۲۵ جون)

لیکن کیا ان کے امیر کا یہ ارشاد نہیں ہے۔

> کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لئے یہ کوئی دلیل ہی نہیں کہ بزرگوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یا دنیا میں آجکل ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دنیا میں تو پہلے بھی حماقتیں ہوئی ہیں اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ ہمارا کام ان حماقتوں کی اندھا دھند پیروی کرنا نہیں۔ ہمارا کام یہ نہیں کہ آنکھیں بند کر کے قدیم یا جدید زمانے کے ہر طریقے کی پیروی کرنے لگ جائیں۔۔۔۔ ہمیں خدا نے عقل اسی لئے دی ہے کہ دنیا کے اچھے برے میں تمیز کریں　　(تنقیحات ص۱۵۱)

باقی رہے اسلاف تو ان کے متعلق ارشاد ہے کہ

> آخر معلوم تو ہو کہ یہ "سلف" کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے (تفہیمات حصہ دوم ص۳۶۲)

حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کی مخالفت کی وجہ نہ قوانین شریعت کا احترام ہے۔ اور نہ اسلاف کی اتباع کا جذبہ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ان کی اپنی ہستی کا مدار اس میں ہے کہ "اسلام خطرے میں ہے"۔ آئین پاکستان کو اسلامی تسلیم کر لینے سے انہوں نے بالواسطہ اس حقیقت کو تو تسلیم کر لیا کہ اسلام اب خطرہ میں نہیں رہا، لیکن یہ صورت حالات ان کے لئے سخت نقصان دہ ہے اس لئے اب انکی ساری کوششیں اس میں صرف ہو رہی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کے لئے نئے نئے خطرے تراشے جائیں۔ ان سفارشات کی مخالفت اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ورنہ آپ نے دیکھ لیا کہ جن اصولوں کی بنا پر اصلاحی صاحب انکی مخالفت کر رہے ہیں، ان اصولوں کی تردید خود مودودی صاحب کر چکے ہیں۔

لیکن ہمیں اس باب میں اصل خطرہ خود کمیشن کی اس "دو دلی" کی پالیسی کی طرف سے ہے جس کی تصریح گذشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے۔ یعنی ایک طرف وہ "حسبنا کتاب اللہ" کا اعلان کر رہے ہیں اور دوسری طرف وہ کتاب و سنت" دونوں کو یکساں سند تسلیم کرتے ہیں اور سنت کو کتاب کی طرح غیر متبدل قرار دیتے ہیں، چنانچہ اس ضمن میں کمیشن کے سکریٹری خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اپنے رسالہ ثقافت (بابت جولائی ۱۹۵۶ء) کے تاثرات میں مولوی صاحبان کی اس مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> کمیشن کی یہ سفارشات کن تفصیلی دلائل پر مبنی ہیں اور کتاب و سنت سے کیونکر ان کی تائید ہوتی ہے۔ ان سے متعلق اگلی اشاعت میں مستقل سلسلۂ مضامین کا انتظار فرمائیے۔

اب ہوگا یہ کہ ثقافت میں ان سفارشات کی تائید میں جو احادیث پیش کی جائیں گی فریق مخالف کی طرف سے ان احادیث کو ضعیف قرار دیا جائیگا اور ان کے مقابل میں دوسری احادیث پیش کی جائیں گی جن سے فریق مخالف کے مسلک کی تائید ہوتی ہو روایات کے مجموعوں میں

اس قسم کی احادیث کا مل جانا مستبعد نہیں) اس کے علاوہ فقہ اور جمہور کے مسلک کو بھی بطور تائید پیش کیا جانے لگا اور بحث و نظر کا یہ سلسلہ ایسا لا انتہا ہو جائیگا کہ بات کسی فیصلہ تک پہنچ ہی نہیں سکے گی۔ قرآن سے باہر سنت کا جو حصہ ہے اسے نہ رسول اللہ نے دین قرار دیا اور نہ ہی صحابہ کبارؓ نے اسے سند قرار دیا ہے یہی بنیادی نقص ہے جس کی وجہ سے اسلام میں (جو ایک ہی دین تھا) اس قدر مسالک مذاہب پیدا ہو چکے ہیں اور ہر فرقہ اپنے مسلک مذہب کو حق سمجھتا ہے اس صورت حالات کا علاج صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اصولی طور پر دین میں سند مطلق صرف قرآن کو سمجھا جائے اور سنت رسول اللہ کے اس حصہ کو یقینی تسلیم کیا جائے جو خود قرآن کے اندر موجود ہے۔ سنت کا جو حصہ قرآن سے باہر ہے اس کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآن کو قرار دیا جائے۔ اور اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ وہ اسلامی نظام جو علیٰ منہاج نبوت قائم ہو قرآنی اصولوں کی جزئیات میں حالات کے تقاضے کے مطابق تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ طلوع اسلام کا یہی مسلک ہے جسے اس کے مخالفین "انکار سنت" قرار دے کر اسے مطعون کر رہے ہیں۔ اگر کمیشن بھی اسی اصول کو پیش نظر رکھتا تو اس کی جو سفارشات اس وقت قرآن سے ٹکرا رہی ہیں وہ بھی ایسی نہیں ہوتیں اور دین کی بنیادوں پر ان سفارشات کی مخالفت بھی نہ ہو سکتی۔

ہم حکومت سے استدعا کریں گے کہ وہ کمیشن کی سفارشات کے معاملہ میں اپنے روایتی تساہل کو چھوڑ کر بہت جلد عملی قدم اٹھائے کیونکہ اس باب میں جتنی تاخیر ہو گی ملک میں انتشار پیدا کرنے والے عناصر کو شر انگیزیوں کے لئے اتنا ہی زیادہ موقعہ مل جائے گا (اس وقت بھی بعض گوشوں میں انہیں سیاسی مفاد کے لئے استعمال کرنے کی مذموم کوششیں کی جا رہی ہیں) واضح ہے کہ کوئی انسانی کوشش بھی غلطی سے مبرا نہیں ہو سکتی لیکن جس مملکت کا نظم و نسق آئین کے مطابق چل رہا ہو اس میں اس قسم کی غلطیوں کا ازالہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا حکومت کو ان اصلاحات کے لئے بہت جلد عملی قدم اٹھانا چاہیئے تاکہ ہماری آئینی تبدیلی سے معاشرہ میں کچھ تو اصلاحی تبدیلی ہو۔ آئین پاکستان کی تدوین کے بعد یہ پہلا موقعہ آیا ہے کہ ہم اس اصول کو عملی تشکیل دے سکیں کہ ہمارے شرعی قوانین میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اگر حکومت نے اس باب میں تساہل برتا تو زمانے کی رو ہمیں اور پیچھے دھکیل دیگی جس کے بعد نہ معلوم ہم کب پھر آگے بڑھ سکیں۔ بہرحال کمیشن نے اس باب میں فی الجملہ ایک اچھی مثال قائم کر دی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت اپنی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتی ہے!

اگلے پرچے میں

محترم پرویز صاحب کا ایک اہم مضمون شائع ہو رہا ہے جس کا عنوان ہے

"علماء کون ہیں؟"

اس مضمون کی اہمیت کے پیش نظر فیصلہ کیا گیا ہے کہ "روٹی کے مسئلہ" کی طرح اس کا بھی پمفلٹ الگ شائع کیا جائے۔ بزمہائے طلوع اسلام سے درخواست ہے کہ وہ جلد از جلد اطلاع دیں کہ انہیں اس پمفلٹ کی کس قدر کاپیاں درکار ہوں گی۔

(۲) پمفلٹ "روٹی کا مسئلہ" کا پہلا اسٹاک ختم ہو گیا ہے۔ اسے دوبارہ چھپوایا جائیگا اگر کسی بزم کو اس کی بھی ضرورت ہو تو وہ جلدی اطلاع دیں کہ انہیں کس قدر کاپیاں مطلوب ہیں۔ دوبارہ چھپوانے کی وجہ سے اس پمفلٹ کی قیمت ۲ر۲ فی نسخہ ہو گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۳/۱۵۹۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

سلیم کے نام

(کائنات کے دو عظیم انقلاب)

تمہارا خط مختلف مقامات کی سیر کرتا کراتا مجھے یہاں ریاست سوات میں ملا جہاں میں وسطِ مئی سے آیا ہوا ہوں۔ اس علاقہ کا تفصیلی تعارف تو کسی اور وقت کروں گا۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ ان وادیوں میں فطرت نے اپنی حسن پاشیوں میں کسی قسم کا بخل نہیں برتا لیکن چونکہ انسانی ہاتھ نے ابھی تک اس کی مشاطگی نہیں کی۔ اس لئے اس حسن میں نکھار نہیں پیدا ہو سکا۔ جس دن انسان نے اس کی تزئین و آرائش کی طرف توجہ کی، نہ معلوم یہ شگفتہ و شاداب خطۂ زمین کیا سے کیا بن جائے گا۔ لیکن میرے لئے یہ حسنِ معصوم بھی اپنے اندر کم جاذبیت نہیں رکھتا اس کی کشادہ وادیاں کَیْفَ سُطِحَتْ۔ اس کی محکم پہاڑیاں کَیْفَ نُصِبَتْ اور اس کی فلک بوس برف آلود چوٹیاں کَیْفَ رُفِعَتْ کی جیتی جاگتی تفسیریں اور ان سے ترتیب پائے ہوئے رنگین مناظر کَیْفَ خُلِقَتْ کی زندہ تصویریں ہیں۔ میرے کمرے کے دریچے کے سامنے دریائے سوات (جسے یہاں لوگ سِندھ کہتے ہیں) اپنے مسلسل زیر و بم کے ساتھ سلسبیلانہ انداز سے محوِ خرام ہے۔ اس کی لہروں کی رنگینیاں میرے لئے جنتِ نگاہ اور اس کی آبشاروں کی نغمہ آفرینیاں فردوسِ گوش ہیں۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوں اور عجیب و غریب خیالات میں گم ہو جاتا ہوں میں اکثر سوچتا ہوں کہ جسے ہم دریا کہتے ہیں وہ درحقیقت ہے کیا؟ وہ پانی جس سے دریا کا وجود قائم ہے، پیچھے سے مسلسل آتا اور آگے بڑھتے چلا جاتا ہے۔ تو کیا اس پانی کو جو ابھی یہاں تھا، اور ابھی کہیں کا کہیں چلا گیا۔ دریا کہیں گے جو ہزاروں سال سے یہاں موجود ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک ہر آن تغیر پذیر شے کس طرح ثابت قرار پا سکتی ہے؟ تو کیا دریا کے بطن (BED) کو دریا کہا جائے گا۔ جو اگرچہ مستقلاً اپنی جگہ پر قائم ہے لیکن جو تغیر پذیر پانی کے بغیر دریا کہلا ہی نہیں سکتا۔ اگر اس میں پانی نہ ہو تو اس میں اور اس کے ارد گرد کی زمینوں میں کیا فرق ہے؟ دریا درحقیقت نام ہے اس ثبات (PERMANENCE) اور تغیر (CHANGE) کے مجموعہ کا، یعنے جس طرح انسان نام ہے نہ بدلنے والی ذات (PERSONALITY) اور ہر آن بدلنے والے خیالات کے مجموعہ کا۔ ایک خیال آتا ہے جس سے ہم خوش ہو جاتے ہیں۔ وہ نہایت خاموشی سے اس طرح آگے بڑھ جاتا ہے جس طرح سورج کے سامنے سے بادل گذر جاتا ہے۔ پھر ایک اور خیال آ جاتا ہے جس سے ہم غمگین ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی اسی طرح آگے بڑھ جاتا ہے۔ خیالات کی یہ رو آتی رہتی اور جاتی رہتی ہے لیکن ہماری ذات مستقلاً اپنے مقام پر موجود رہتی ہے۔ اسی طرح جیسے پانی کی لہریں آتی رہتی ہیں اور جاتی رہتی ہیں۔ لیکن دریا کا بطن اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ وہ پانی کے مسلسل تغیر سے اثر پذیر نہیں ہوتا لیکن یہ دریا اس وقت تک دریا ہے جب تک اس کا

پانی ساحلوں میں پابند ہے۔ اگر یہ ان ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جائے تو اسے دریا نہیں بلکہ سیلاب کہا جائے گا۔ جس کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہوگا۔ انسانی خیالات و جذبات بھی اسی وقت تک انسانی کہلا سکتے ہیں جب تک وہ قوانین خداوندی کے ساحلوں میں محصور رہیں اگر وہ ان سے سرکشی اختیار کر جائیں تو وہ انسانی نہیں حیوانی، بلکہ شیطانی ہو جائیں گے جس کا نتیجہ نوع انسانی کے لئے تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ انسانی ذات کے استحکام کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے جذبات و خیالات قیود نا آشنا نہ ہو جائیں۔ لیکن اس پابندی کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ یکسر جامد اور متعطل ہو جائیں۔ اگر دریا کے پانی کی روانی ختم ہو جائے تو وہ دریا نہیں رہتا جوہڑ بن جاتا ہے جس میں کچھ دنوں کے بعد بو پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہی پانی جو ہر قسم کی کثافت کو صاف کرنے کے کام آتا تھا خود کثیف بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو تقلید کی زنجیروں میں جکڑ کر زندگی کی روانی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس میں نہ ندرت فکر رہتی ہے نہ جدت کردار۔ وہ ہر دم تازہ بہنے والی جوئے آب کی جگہ ایک تنگ و تاریک جوہڑ بن جاتی ہے۔ جس سے ساری فضا متعفن ہو جاتی ہے۔ وہ زندہ قوموں کی صف سے نکل کر جن کی تقدیریں صبح و شام بدلتی رہتی ہیں۔ قبرستان میں تبدیل ہو جاتی ہے جس میں موت کا نام سکون اور بے حسی اور بے حرکتی کا نام اطمینان رکھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا جاتا ہے۔ ان کے سانس لینے کی وجہ سے ان لوگوں کو زندہ سمجھ لیا جاتا ہے لیکن درحقیقت زندہ نہیں مردہ ہوتے ہیں۔ وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ

میکدہ تہی سبو حلقۂ خود فراموشاں ‏ مدرسہ بلند بانگ بزم فسردہ آتشاں
فکر گرہ کشا غلام، دیں برداستے تمام ‏ زانکہ درون سینہ ہا دل ہدفے است بے نشاں

دیکھو سلیم! پہنچا تھا میں تمہارے خط کا جواب لکھنے لیکن تصورات مجھے کہاں سے کہاں لے گئے۔ اچھا لو۔ اب اپنے خط کا جواب سنو۔ اگرچہ اس تشبیب میں بھی تمہیں کئی کام کی باتیں مل جائیں گی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں سلیم! کہ کائنات کی تخلیق ایک ایسا محیر العقول کارنامہ ہے کہ انسانی عقل جوں جوں اس کی گہرائیوں اور پہنائیوں پر غور کرتی ہے۔ قدم قدم پر اس کی عظمت اور اپنے عجز کا اعتراف کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس تخلیقی پروگرام میں دو مقام ایسے آتے ہیں جنہیں فی الحقیقت عظیم انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ یعنی اس عظیم پروگرام کے اندر عظیم انقلابی مراحل۔ افسوس ہے کہ انسان نے ابھی تک ان انقلابی مراحل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں لگایا جس کی وجہ سے وہ کائنات میں اپنے صحیح مقام کا اندازہ اور اس تک پہنچنے کے لئے طریق عمل کا صحیح تعین نہیں کر سکا اور اس سے بھی زیادہ قابل تاسف اس حقیقت کا احساس ہے کہ اس باب میں مسلمان سب سے پیچھے ہے حالانکہ یہ ہر وقت اس کتاب عظیم کو اپنے سامنے رکھتا ہے۔ جس نے ان انقلابی مراحل کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ اور انہیں اس طرح ابھار اور نکھار کر بیان کیا ہے کہ ان کی عظمت بادنیٰ تعمق سامنے آ جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک مسلمان ان مقامات کی عظمت کا صحیح صحیح اندازہ نہ کر لے، وہ قرآن کے پیغام اور اقوام عالم میں اپنی پوزیشن کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مختصر سے خط میں ان مقامات کا اجمالی تعارف کرا دوں (کیونکہ ان کے تفصیلی تعارف اور تبیین کے لئے تو بڑی فرصت کی ضرورت ہے) اسے تم غور سے سمجھنے کی کوشش کرنا۔ کیونکہ بات ذرا مشکل اور گہری ہے۔

تخلیقِ کائنات

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق بالمقصد کی ہے۔ اور جب کسی چیز کو کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا جائے تو سب کچھ ایک پلان (PLAN) کے مطابق کیا جاتا ہے۔ لہٰذا کائنات کی تخلیق ایک پلان کے مطابق ہوئی ہے پلان کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہر پرزہ کے ذمہ ایک خاص فریضہ لگایا گیا ہے۔ اور مختلف پرزوں کے باہمی تعاون و تناصر کے لئے خاص قاعدے مقرر کئے گئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر کائنات کی یہ عظیم القدر مشینری ایک خاص نظم و ضبط اور قاعدے اور قانون کے مطابق سرگرمِ عمل ہے وَقَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳) یقیناً اللہ نے ہر شے کے لئے پیمانے بنا دیئے ہیں۔ قَدْر پیمانے یا اندازے کو یا دورِ حاضر کی سائنٹفک اصطلاح میں (MEASUREMENT) کہتے ہیں۔ مقدور کے معنی (MEASURED) یا (DETERMINED) کے ہوں گے وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸) اور اللہ کا ہر امر اندازے کے مطابق متعین کردہ ہے۔ خدا کے متعین کردہ انہی اندازوں کو قوانینِ فطرت یا (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ سائنس کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے ان قوانین کو کس حد تک دریافت کر لیا ہے۔ سائنسدان ان قوانین کو ایجاد نہیں کرتا۔ ان کا صرف انکشاف (DISCOVRRY) کرتا ہے۔ ان قوانین کے محکم اور غیر متبدل ہونے کا نتیجہ ہے کہ ایک سائنسدان پورے حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اگر فلاں اور فلاں چیز کو یوں ملا دیا جائے تو اس سے یہ کچھ بن جائے گا۔ کائنات کے یہ اجزاء اس قدر محکم انداز سے سرگرمِ عمل ہیں۔ کس قدر باریک، لطیف اور نازک ہیں اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک ایٹم (ATOM) مرکب ہوتا ہے (PROTONS) اور (ELECTRONS) سے۔ ایک برقیہ (ELECTRON) کی ضخامت ایک انچ کے کروڑویں حصہ کے برابر ہوتی ہے۔ یہ پروٹون اور الیکٹرون اپنے محور کے گرد چودہ سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گھومتے ہیں۔ ان کی یہ گردش بالکل ویسے ہی ہے جیسے فضائے آسمانی میں نظامِ شمسی کے مختلف کروں کی گردش۔ پھر مختلف اجزائے کائنات کی ساخت میں ان الیکٹرون وغیرہ کے صحیح صحیح تناسب کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اگر کاربن کی ساخت میں ایک الیکٹرون کی کمی رہ جاتی تو اس کرۂ ارض پر زندگی (LIFE) ناممکن ہو جاتی۔ یا آکسیجن اور ہائیڈروجن جس محکم طریق سے باہم گھل کر پانی بن گئی ہیں، اگر ان کے اختلاط میں ذرا سا بھی ڈھیلا پن رہ جاتا تو یہ دنیا کبھی کی تباہ ہو جاتی۔ علاوہ اس کے کائنات کے مختلف اجزاء میں باہمی ربط و ضبط ایسا محکم ہے کہ علم الحیات (BIOLOGY) کے ماہرین کا اعلان ہے کہ یہ تمام کائنات ایک نامی جسم کی طرح (ORGANIC) ہے۔ کائنات کی اسی وحدت کی بنا پر اسے (UNI-VERSE) کہتے ہیں۔

کائنات کی طرف وحی

کائنات کی ہر شے کے اندر وہ قانون از خود موجود ہوتا ہے جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے (یہ ہے سلیم! وہ نقطہ جس کے لئے میں نے اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھی ہے) اس کو اس شے کی فطرت کہتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ ہر شے کو اپنے اپنے فرضِ منصبی کا علم ہوتا ہے اور اس کا بھی پتہ ہوتا ہے کہ اس فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے اسے کیا کرنا ہے قرآن کے الفاظ میں کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ (۲۴/۴۱) کائنات کی ہر شے اپنی تسبیح و صلوٰۃ سے واقف ہے (تسبیح و صلوٰۃ کے قرآنی مفہوم کو تم نے سمجھ لیا سلیم!) اسے قرآن نے وحی بھی کہا ہے وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (۱۶/۶۸) خدا نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (۴۱/۱۲) ہر کرۂ سماوی کی طرف اس کے فریضہ کے متعلق وحی کر دی۔ یا سورۂ زلزال میں زمین کے متعلق ہے کہ بِاَنَّ رَبَّکَ

اَوْحٰی لَھَا (۹۹/۵) ان قوانین کے لئے وحی کا لفظ استعمال کرنے میں سلیم! ایک نکتہ اور بھی ہے۔ وحی کے معنی خفیف اور تیز اشارے کے ہوتے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء سے "اشاروں" میں بات کی ہے۔ اس لئے ان اشاروں کی حقیقت اور ان کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کے لئے علم اور تجسس درکار ہے۔ اسی کو سائنس کا علم کہتے ہیں جس کے لئے بڑی باریک بینی اور خاموش مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء سے پردہ میں بات کی ہے۔ ان پردوں کو اٹھانا سائنسدان کا کام ہے۔ یعنی حقیقت کو (DIS-COVER) کرنا۔ اس قسم کے تدبر و تفکر اور تجارب و مشاہدات کے بعد یہ امر کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ فطرت کے یہ قوانین جو اس قدر خاموش اشاروں میں بیان ہوئے ہیں کس قدر واضح متعین اور مفصل اور ایک دوسرے کے مطابق و موافق واقع ہوئے ہیں۔ ان میں کہیں اختلاف نہیں۔ ابہام نہیں۔ عدم تعین نہیں۔ سہو نہیں۔ خطا نہیں۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳)

کائنات میں جبر ہے

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا سلیم! کہ اشیائے کائنات میں سے ہر ایک کو اس کا علم براہ راست دیا گیا ہے جس کے مطابق اسے زندگی بسر کرنی ہے۔ یہ علم اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۷/۱) وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۵) جو کچھ ان سے کہا گیا ہے۔ وہ اس کے مطابق عمل کئے جا رہے ہیں وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰) وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے پوری پوری قوت سے سرگرداں رہتے ہیں۔ اور نہایت سرعت اور تیزی سے دور دور نکل جاتے ہیں نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ (۲/۳۰) نُسَبِّحُ میں سلیم! عمل کی (INTENSITY) پائی جاتی ہے اور نُقَدِّسُ میں (EXTENSIVE NESS) یعنی تمام اشیائے فطرت مشیت کے پروگرام کی تکمیل میں پوری قوت اور وسعت سے سرگرم عمل ہیں۔ کسی کو اس سے مجال سرتابی نہیں یارائے سرکشی نہیں وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (۱۶/۵۰) یعنی ان میں سے کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ چاہے تو اس قانون کی اطاعت کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی کرلے۔ اشیائے فطرت میں کسی قسم کا اختیار و ارادہ ہوتا ہی نہیں۔

جو کچھ میں نے اوپر لکھا ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ

(۱) اشیائے فطرت میں سے ہر ایک کو اللہ کی طرف سے براہ راست اس قانون کا علم دیدیا گیا ہے۔ جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہے۔

(۲) یعنی یہ علم ان اشیاء کی فطرت میں داخل ہے۔

(۳) وہ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے پر قادر ہی نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو قانون کسی شے کی فطرت کے اندر داخل ہو وہ شے اس سے سرکشی اختیار ہی نہیں کر سکتی۔ پانی کو اس کا اختیار ہی نہیں کہ وہ نشیب کی بجائے فراز کی طرف بہنے لگ جائے۔

پہلا انقلاب

سلسلۂ کائنات اسی طریق پر چلا آ رہا تھا کہ مشیت کے پروگرام کے مطابق ان دو عظیم انقلابات میں سے پہلا انقلاب واقع ہوا۔ جن کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ یہ انقلاب تھا انسان کی پیدائش اور اس کی وجہ سے وحی کے سابقہ نظام

میں ایک بہت بڑی تبدیلی۔ سابقہ مخلوقات کے علی الرغم انسان کو صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا۔ اس کی اس خصوصیت کبریٰ کو اللہ تعالیٰ نے "الوہیاتی توانائی کا ایک شمہ" (نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي (۱۵/۲۹) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس قسم کی تخلیق کو جو سلسلۂ ارتقار کی سابقہ کڑیوں سے مختلف ہو، دورِ حاضر کی اصطلاح میں فجائی ارتقار یا (EMERGENT EVOLUTION) کہتے ہیں۔ گویا انسان کی تخلیق اس قسم کے فجائی ارتقار کے طور پر عمل میں آئی ہے۔ لیکن جس طرح کائنات کی دیگر اشیاء کے لئے وہ قوانین مقرر کئے گئے ہیں۔ جس کے مطابق زندگی بسر کر کے وہ مشیت کے پروگرام کو پورا کرتی ہیں۔ انسان کے لئے بھی ایسے قوانین متعین کر دیئے گئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وہ اپنی تخلیق کا مقصد پورا کر سکتا ہے۔ اگر ان قوانین کو (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) اس کی فطرت کے اندر رکھ دیا جاتا۔ یعنی ان کا علم براہِ راست ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ ہی دے دیا جاتا۔ تو انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ان قوانین پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتا۔ لیکن یہ چیز اس کے اختیار وارادے کے خلاف جاتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی طرف اپنی وحی بھیجنے کے طریق میں ایک عظیم تبدیلی کی۔ اسے پھر سن لو سلیم! کہ اشیائے کائنات کی طرف وحی بھیجنے کا طریق یہ ہے کہ ہر شے اور ہر نوع کی طرف خدا کی طرف سے براہِ راست وحی کی جاتی ہے۔ مرغی کا بچہ انڈے سے باہر نکلتے ہی ان قوانین سے واقف ہوتا ہے۔ جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ وہ خشکی پر رہتا ہے پانی کے قریب تک نہیں جاتا۔ آگ سے دور بھاگتا ہے۔ دانہ دنکا چگتا ہے۔ بطخ کا بچہ انڈے سے باہر آتے ہی پانی پر لپکتا ہے۔ یہ کچھ اسے خدا کی طرف سے براہِ راست وحی کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انسانی بچہ خیر و شر سے قطعاً ناواقف ہوتا ہے۔ اسے اس کا علم براہِ راست خدا کی طرف سے نہیں ملتا۔ نوعِ انسانی کے ہر فرد کی طرف وحی نہیں ہوتی۔ یہ چیز اس کی فطرت میں داخل نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میں تمہیں اس سے پہلے ایک خط میں بتا چکا ہوں۔ انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت، جمادات، نباتات و حیوانات کی ہوتی ہے۔ جن میں اختیار وارادہ نہیں ہوتا۔

انسان کی طرف وحی

انسان کے سلسلہ میں خیر و شر کا علم دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے طریق یہ تجویز کیا ہے کہ نوعِ انسانی کے ایک فرد کو اس مقصد کے لئے منتخب کر لیا جاتا۔ اور اسے خیر و شر کا علم بذریعہ وحی دیدیا جاتا۔ پھر اسے کہہ دیا جاتا کہ اس علم کو وہ دیگر افرادِ انسانیہ تک پہنچا دے۔ اور اسے ان انسانوں پر چھوڑ دے کہ وہ چاہیں تو اس علم کی راہ نمائی میں زندگی بسر کریں۔ اور چاہے تو اس کے خلاف راستہ اختیار کر لیں۔ اس طرح سلیم! خدا کی وحی بھی انسانوں تک پہنچ گئی۔ اور انسانی اختیار وارادہ بھی بدستور باقی رہا۔ ان برگزیدہ انسانوں کو جن کے ذریعہ خدا کی وحی باقی افرادِ انسانیہ تک پہنچائی جاتی تھی۔ نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ وحی کے اس طریق جدید کے متعلق نوعِ انسانی سے کہا گیا کہ (إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۷/۳۵) جب ایسا ہوگا کہ تمہارے پاس تم میں سے پیغامبر آئیں گے جو میرے پیغامات تم تک پہنچائیں گے۔ سو جو لوگ ان قوانین کی نگہداشت کریں گے اور ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں گے تو انہیں کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ جہاں تک انسان کے اختیار وارادہ کا تعلق تھا اسے کہہ دیا گیا کہ (قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) "ان سے کہدو کہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے حق آچکا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ یہ کہہ دینا تو محض سمجھانے کی غرض سے ہے

ورنہ یہ چیز وحی کے ــــ طریق کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو انسان کی صورت میں اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی ان قوانین کے اس کی فطرت کے اندر نہ ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسے اس کی آزادی حاصل ہے کہ وہ ان قوانین کو اختیار کرے یا اس سے انکار کردے۔ اگر انسان کو اس امر کی آزادی دینا مقصود نہ ہوتا تو دیگر اشیائے کائنات کی طرح وحی کو اس کی فطرت کے اندر رکھ دیا جاتا۔ یہ مطلب ہے سلیم! لا اکراہ فی الدین کا۔ یعنی دین کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی نہیں۔ زبردستی سے لایا ہوا ایمان، ایمان ہی نہیں ہوتا۔ ایمان وہی ایمان ہے جسے انسان خود

لا اکراہ فی الدین

اپنی مرضی اور ارادہ سے اختیار کرے۔ اپنے اختیار اور ارادے کے معنی یہ ہیں کہ انسان خود سوچ سمجھ کر ایک نتیجہ پر پہنچے یہی وجہ ہے کہ قرآن غور و فکر اور سوچ بچار کی اس قدر تاکید کرتا ہے۔ اس کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے اور وہ اسے علیٰ وجہ البصیرت ہی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تم دیکھو گے سلیم! کہ قرآن قدم قدم پر تقلید کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ اس لئے کہ تقلید میں انسان اپنے غور و فکر سے کام نہیں لیتا بلکہ معاشرے میں جو عقائد و رسوم متوارث چلی آتی ہیں۔ انہیں بلا سوچے سمجھے اختیار کر لیتا ہے۔ یہ درحقیقت معاشرے کو خدا بنا لینا ہے۔ تقلید کے متعلق یوں سمجھو کہ وہ (SOCIETY DIVINISED) ہوتی ہے، جس طرح جس چیز کو ضمیر کہا جاتا ہے۔ وہ (SOCIETY INTERNALISED) ہوتی ہے۔ اور تو اور جو شخص خود قرآن کو بھی اندھا اور بہرہ بن کر قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مومن قرار نہیں دیتا۔ اس کا ارشاد ہے مومن وہ ہیں کہ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔ غور و فکر کے بعد انہیں اختیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کفار عرب نبی اکرمؐ سے بار بار معجزات طلب کرتے تھے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر ایمان لائیں۔ اور قرآن کی طرف سے بار بار اس کا انکار ہوتا تھا اور ان سے کہا جاتا تھا کہ تم عقل و شعور کو کام میں لاؤ اور سوچ سمجھ کر اس کا فیصلہ کرو کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر تمہاری عقل و فکر کو ماؤف کر کے تم سے اطاعت کرانی ہوتی تو تمہیں بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح پیدا کر دیا جاتا۔ یعنی اس قانون کو تمہاری فطرت کے اندر رکھ دیا جاتا اور تم مجبوراً اس کی اطاعت کئے جاتے۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ انسان کی تخلیق کس طرح دیگر اشیائے کائنات سے منفرد ہے۔ اور خیر و شر کے علم دینے کا جو طریق اس کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ وہ کس طرح ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن کس قدر مقام تاسف و حیرت ہے کہ خود ہمارے ہاں بھی

لیکن مسلمان!

یہ عقیدہ موجود ہے کہ خیر و شر کی تمیز انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے۔ اور انسان کی فطرت خود خدا کی فطرت پر متفرع ہے۔ اس لئے اسلام دین فطرت ہے۔ تم نے غور کیا کہ یہ عقیدہ کس طرح مشیت کے اس سارے پروگرام کی تکذیب کر دیتا ہے جو اس نے انسانی تخلیق اور وحی بوساطت حضرات انبیائے کرامؑ کی شکل میں اختیار کیا تھا۔ فطرت انسانی کے متعلق یہ عقیدہ قدیم فلسفہ میں موجود تھا۔ جہاں سے اسے مسلمانوں نے مستعار لے لیا۔ اور اسے عین دین بنا دیا (اس کے جواز میں جو قرآنی آیات پیش کی جاتی ہیں ان کا صحیح مفہوم میں تمہیں اس خط میں بتا چکا ہوں جو "فطرت انسانی" کے ضمن میں تمہیں لکھا گیا تھا) دور حاضر کے فلسفہ میں اسے (TRANSCENDENTALISM) کہتے ہیں۔ یعنی یہ عقیدہ کہ انسان کے دل میں وجدانی طور پر حق و باطل کے امتیاز کا علم موجود ہے۔ جو تجربات و مشاہدات کی رو سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ قریب قریب اسی کی دوسری شکل ہے جسے (ONTOLOGISM) بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ عقیدہ کہ خدا اور اس کے تصورات

کا علم ہر فرد انسانیہ کے دل میں براہِ راست موجود ہے۔ یہ عقائد دراصل وحی بوساطت انبیائے کرامؑ (یا بالفاظ دیگر ایمان بالرسل) کے تصور کی مخالفت کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بھی ان عقائد کو سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ اس سے سلسلۂ رشد و ہدایت بوساطت انبیائے کرام کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دین میں جبر و اکراہ کو بھی عین اسلام سمجھتے ہیں۔ ذہنی اکراہ کے سلسلہ میں وہ تقلید کو دین کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور قلبی اکراہ کے لئے مرتد کی سزا قتل بتاتے ہیں۔ یعنی جو شخص (کسی وجہ سے) دل سے دین کا قائل نہیں ہوتا اسے بزورِ شمشیر دین کا قائل رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ تمام عقائد قرآن کریم کو پس پشت ڈال دینے کا نتیجہ ہیں۔

عقل و فکر

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ ایک اور خصوصیت بھی ہے جس کی بنا پر انسان دیگر اشیائے کائنات سے منفرد اور وہ ہے عقل و فکر کی صلاحیت۔ کائنات میں عقل و فکر انسان کے علاوہ کسی اور کو نہیں دی گئی۔ اصل یہ ہے کہ جب قانونِ زندگی کو کسی شے کی فطرت کے اندر رکھ دیا جائے۔ اور وہ اس کی اطاعت پر مجبور ہو جائے تو اسے عقل و فکر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ عقل و فکر کی ضرورت اسے ہوتی ہے جسے کوئی مسلک اپنی مرضی اور ارادے سے اختیار کرنا ہو۔ عقل و فکر کی نشوونما علم اور تجربہ سے ہوتی ہے۔ اور چونکہ دیگر اشیائے کائنات عقل و فکر سے عاری ہیں۔ اور اپنے فطری تقاضوں سے اس راستہ پر چلی جا رہی ہیں جو ان کے لئے تجویز کر دیا گیا ہے۔ اس لئے انہیں اس علم کے علاوہ جو ان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے کسی اور علم کی ضرورت نہیں۔ ملائکہ کا یہ اعتراف کہ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (ہمیں اس علم کے علاوہ جو تو نے ہمیں دیا ہے۔ اور کسی بات کا علم نہیں) اس حقیقت کا ترجمان ہے۔ بکری کا بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ ہی وہ سب کچھ جانتا ہے جس کی اسے آخری عمر تک ضرورت ہے۔ اسے اپنی زندگی کے تقاضوں کا علم حاصل کرنے کے لئے کسی اسکول میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن انسانی بچہ بالکل کورا پیدا ہوتا ہے۔ اور اسے ساری زندگی علم حاصل کرنا پڑتا ہے جو اس حقیقت سے واقف ہیں۔ ان کے دل میں ہر وقت یہ آرزو موجزن رہتی ہے کہ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (۲۰/۱۱۹) انسانی عقل و فکر علم و تجربہ سے پختگی حاصل کرتی ہے۔ انسانی بچہ کو علم ماں باپ سے ورثہ میں نہیں ملتا۔ ایک ایم اے پاس باپ کے بیٹے کو بھی اسی طرح الف۔ ب سیکھنی پڑتی ہے جس طرح ایک ان پڑھ باپ کے بچے کو۔ لیکن ہر انسانی نسل (GENERATION) اس علم و تجربہ کی اکتسابی وارث بن سکتی ہے۔ جو سابقہ نسلوں سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم و تجربہ کے میدان میں ہر نئی نسل سابقہ نسل سے ایک قدم آگے ہوتی ہے مثلاً ہم بیسویں صدی کے انسان ہیں۔ ہم نے اپنی زندگی کو اس مقام سے شروع کیا ہے جس مقام تک انیسویں صدی کا انسان پہنچا تھا۔ یعنی انیسویں صدی کے انسان کا آخری مقام ہمارے سفرِ زندگی کا نقطۂ آغاز تھا۔ ہم انیسویں صدی کے انسان سے اتنا ہی آگے ہیں جتنا فاصلہ ہم نے بیسویں صدی میں خود طے کیا ہے۔ یعنی ہمارا علم مجموعہ ہے (۱) اس علم کا جو انیسویں صدی تک سابقہ انسانی نسلوں نے حاصل کیا اور (۲) اس علم کا جو ہم نے بیسویں صدی میں خود حاصل کیا۔ چونکہ انسانی عقل و فکر علم و تجربہ کی بنا پر پختگی حاصل کرتی ہے۔ اس لئے بالفاظ دیگر یوں سمجھو کہ ہر نئی نسل کا انسان عقل و فکر کے اعتبار سے اپنی سابقہ نسل سے آگے ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس کی قوم حصولِ علم میں متواتر کوشاں

ہے (اسے اچھی طرح سمجھ لینا سلیم! کہ یہ کچھ میں نے اکتسابی علم کے متعلق کہا ہے۔ وحی کے متعلق نہیں۔ وحی کو انسان کسب و محنت سے حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ علم نبی کو اس طرح وہبی طور پر عطا ہوتا ہے۔ جس طرح خارجی کائنات میں خدا کی وحی وہبی طور پر ہوتی ہے) اب اور آگے بڑھو۔

وحی اور عقل وحی کا کام یہ ہے کہ وہ عقل انسانی کی راہ نمائی کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قدر انسان کی عقل خام ہوگی اسے اسی قدر تفصیلی راہ نمائی کی ضرورت ہوگی۔ اگر تمہیں کسی سچے کو راستہ بتانا ہو تو اس کے لئے تمہیں بڑی تفصیل سے کام لینا ہوگا۔ لیکن ایک پختہ عقل کے انسان کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہوگا کہ جہاں دو راہا آئے وہاں نشان کا کھمبا (SIGN POSTS) لگا دیا جائے۔ جس پر یہ اشارہ موجود ہو کہ دائیں ہاتھ کی سڑک کس طرف جاتی ہے اور بائیں ہاتھ کی کس طرف۔ وحی خداوندی نے بھی اسی تقاضہ کو سامنے رکھا کہ اور ہر دور کے انسان کو اس کی علمی اور عقلی سطح کے مطابق تفصیلی راہ نمائی دی۔ مثلاً حضرت نوحؑ کے زمانہ میں یہ بات بھی بذریعہ وحی بتانی پڑی کہ سیلاب سے بچنے کے لئے کشتی کس طرح بنانی چاہیئے۔ حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (۱۱/۳۷) ہماری زیر نگرانی ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ! پھر جوں جوں انسانی علم و عقل میں پختگی آتی گئی۔ ان تفاصیل میں کمی ہوتی چلی گئی۔

اس مقام پر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو سلیم! کہ بعض امور وہ ہیں جو انسانی عقل کی حد سے یکسر ماورا ہیں۔ یعنی انسانی عقل خواہ اپنی انتہا تک بھی کیوں نہ پہنچ جائے وہ امور اس کے دائرے سے باہر رہتے ہیں۔ دوسرے امور وہ ہیں جو ایک زمانہ میں انسانی عقل کی حد تک سے آگے ہوتے ہیں۔ لیکن جب انسانی عقل آگے بڑھ جاتی ہے۔ تو وہ امور اس کے دائرے کے اندر آ جاتے ہیں اول الذکر امور وہ ہیں جو ہر نبی کی طرف نازل شدہ وحی میں یکساں طور پر آتے رہے۔ اور ہر زمانہ کے انسان کو ان کی ضرورت رہی اور ضرورت رہے گی۔ لیکن دوسری قسم کے امور وہ ہیں جن کی تفاصیل میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ یعنی جوں جوں انسان کی عقل آگے بڑھتی رہی ان تفاصیل میں کمی ہوتی چلی گئی۔

دوسرا انقلاب یہ سلسلۂ وحی اس طرح مسلسل آگے بڑھتا چلا آیا تا آنکہ مشیت کے پروگرام میں اس دوسرے عظیم انقلاب کا وقت آ گیا۔ جس کی طرف میں نے شروع میں اشارہ کیا ہے۔ اب انسانیت کے لئے اس دور میں داخل ہونے کا وقت آ گیا جس میں اس کی عقل نے بالغ ہو کر پختگی حاصل کر لینی تھی۔ چنانچہ اس دور کے آغاز میں کہا یہ گیا کہ ان تمام امور کے متعلق جن تک پہنچنا عقل انسانی کے لئے ممکن نہیں یا جن تک پہنچنے کے لئے اسے قرنہا قرن درکار ہیں۔ وحی کی راہ نمائی اصولی طور پر دیدی گئی۔ اس وحی کو قرآن کی دفتین میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد سلسلۂ وحی یکسر بند کر دیا گیا۔ یعنی نبوت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ ہے سلیم! دوسرا عظیم انقلاب جو اس کارگہ کائنات میں رونما ہوا۔ یعنی پہلا انقلاب تو یہ تھا کہ وحی کو (اشیائے کائنات کی طرح) انسانی فطرت میں داخل کرنے کے بجائے اسے ایک فرد کے ذریعہ باقی انسانوں تک پہنچانے کا طریق اختیار کیا گیا۔ اور دوسرا انقلاب یہ تھا کہ وحی کی اصولی تعلیم کو منضبط کر کے مزید سلسلۂ وحی کو ختم کر دیا گیا۔ سوچو سلیم! کہ سلسلۂ تخلیق کائنات میں یہ انقلاب کس قدر عظیم و غریب ہے!

آگے بڑھنے سے پہلے اس مقام پر ایک اور نقطہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ میں نے اوپر کہا ہے کہ بعض امور وہ ہیں جن تک عقلِ انسانی از خود پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حقائق کا دریافت کر لینا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن عقلِ انسانی اپنے تجرباتی طریق سے ان حقائق کی صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہے۔ مثلاً خدا کی صفات اور مستقل اقدار کیا ہیں۔ عقلِ انسانی انہیں از خود معلوم نہیں کر سکتی۔ یہ صرف وحی بتا سکتی ہے۔ لیکن ان صفاتِ خداوندی کا کائنات میں ظہور کس طرح ہوتا ہے۔ اور مستقل اقدار کی رُو سے کیا کیا تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں، عقلِ انسانی ان باتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی ہے۔ یہ مطلب ہے قرآن کی اس آیۂ جلیلہ کا جس میں کہا گیا ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) "ہم انہیں اپنی نشانیاں نفس و آفاق میں دکھاتے جائیں گے۔ تا آنکہ یہ بات نکھر کر ان کے سامنے آ جائے کہ قرآن میں بیان کردہ امور فی الواقع حقیقتِ ثابتہ ہیں۔"

اس ضمنی توضیح کے بعد پھر اصل موضوع کی طرف آؤ۔ تم نے غور کیا ہے سلیم! کہ یہ انقلابات کس حقیقت کا اعلان تھے۔ پہلا انقلاب اس امر کا اعلان تھا کہ انسان اس تمام کائنات میں منفرد اور واجب التکریم واقع ہوا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ۔ اور دوسرا انقلاب اس بلند حقیقت کا اعلان یہ تھا کہ اب انسانیت عمرِ بلوغت اور سنِ رشد و تمیز کو پہنچ رہی ہے۔ اب یہ اس دور میں پہنچ رہی ہے۔ جہاں اس کی عقل پختہ اور اس کا علم محکم ہوتا چلا جائے گا۔ اب اسے بچوں کی طرح ذرا ذرا سی تفاصیل بتانے کی ضرورت نہیں رہی

تفاصیل کا علم

اب بچہ سیانا ہو گیا ہے۔ اب یہ سمجھدار ہو گیا ہے۔ اب اسے صرف اصولی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ ان اصولوں کی روشنی میں یہ اپنے لئے ضروری تفصیلات خود مرتب کرے گا۔ اصول ناقابلِ تغیر ہوتے ہیں۔ لیکن تفاصیل ہر دور میں بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے ان تفاصیل کو اس کی سمجھ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اب یہ بچہ ماشاء اللہ جوان ہو گیا ہے۔

یہ تھا سلیم! ختمِ نبوت کا مفہوم۔ یہ تھا اس کا مقصد۔ اگر تم اس نقطۂ نگاہ سے انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالو تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے گی کہ نبی اکرمؐ شاہراہِ کاروانِ انسانیت پر ایک حدِ فاصل کے طور پر تشریف فرما ہیں۔ حضورؐ سے پہلے ادوار کی انسانیت اپنے بچپن کے زمانہ میں تھی اس کے بعد اس کی جوانی کا زمانہ شروع ہو گیا۔ انسانی عقل و علم نے قرآن سے پہلے کے چار پانچ ہزار سال میں اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ جتنی ترقی تیرہ چودہ سو سال میں کی ہے۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ ترقی برق رفتار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تم گذشتہ چالیس پچاس سال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالو اور پھر سوچو کہ اتنے قلیل سے عرصہ میں ہی دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔ کیا یہ سب تبدیلیاں اس حقیقت کی شاہد نہیں ہیں کہ حضورؐ کی بعثت سے انسانیت ایک نئے دور میں داخل ہو گئی ہے؟ کیا یہ تمام شہادات ختمِ نبوت ہی کی موید نہیں ہیں؟

لیکن سلیم! جس طرح مسلمانوں نے پہلے انقلاب کی اہمیت کو صحیح طور پر نہ پہچانا۔ اسی طرح یہ اس دوسرے انقلاب کی اہمیت کا بھی اندازہ نہیں لگا سکے۔

لیکن مسلمان؟

ہم نے نظری طور پر تو ختمِ نبوت کو اپنا جزوِ ایمان سمجھا لیکن عملاً قدم قدم پر اس سے انکار کرتے چلے گئے۔ چنانچہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے کہ نبی اکرمؐ کے بعد منتخب افراد کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔ کہیں یہ علم، بالکل نبی کی طرح وہبی طور پر ملتا ہے (جیسا کہ شیعہ حضرات کے ہاں ائمہ کرامؑ کے متعلق عقیدہ ہے) اور کہیں اسے اکتسابی طور پر حاصل

کیا جا سکتا ہے جیسے اولیائے کرام کا کشف و الہام۔ اسی امکان کو آگے بڑھا کر، ہمارے زمانہ میں مرزا غلام احمد نے وہبی اور اکتسابی ڈانڈے ملا دیئے۔ اور یہ دعوے کر دیا کہ میں اکتسابی طور پر مقام نبوت تک پہنچ چکا ہوں۔ اسی امکان سے ہر صدی کے سر پر ایک مجدد کا عقیدہ وضع کیا گیا اور اسی سے مہدی آخر الزمان کا عقیدہ۔ یہ عقائد ختم نبوت کی حقیقت کبریٰ کا صحیح اندازہ نہ کر سکنے کا نتیجہ ہیں۔ اور مہر نبوت کے توڑ دینے کا ذریعہ۔ ان کے علاوہ ایک اور عقیدہ بھی ہے جو اس انقلاب عظیم کا صحیح اندازہ نہ لگانے کا نتیجہ ہے۔ جو ختم نبوت کے اعلان سے کائنات میں رونما ہوا تھا۔ تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ ختم نبوت کا مفہوم یہ تھا کہ اب انسانوں کو صرف اصولی راہ نمائی کی ضرورت ہے ان اصولوں کی روشنی میں تفصیلات وہ خود متعین کریں گے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا (اور اسی عقیدہ پر مسلمانوں کا عمل چلا آ رہا ہے) کہ زندگی کے ہر معاملہ کی ہر تفصیل بھی پہلے سے متعین کر دی گئی ہے۔ اور ان تفاصیل میں اب کسی قسم

تفاصیل غیر متبدل ہیں!

کا رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ یہ عقیدہ اس مقصد عظیم کے منافی ہے جس کے لئے ختم نبوت کا انقلاب عمل میں لایا گیا تھا۔ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ جب یہ کہا تھا کہ یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ أَشْیَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ۔ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِیْنَ (5/101-102) یعنی خدا نے قرآن میں جن تفصیلات کو بیان نہیں کیا تو یہ بھول چوک کی وجہ سے نہیں ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ ان تفاصیل کا وحی کی رو سے متعین کرنا مقصود ہی نہ تھا۔ اس لئے اے جماعت مومنین۔ تم ان تفاصیل کے متعلق خواہ مخواہ پوچھنا شروع کر دیا کرو۔ اس وقت وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر تمہارے دریافت کرنے پر ان چیزوں کو بیان کیا گیا تو تم مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ وحی کا سلسلہ بند ہو جانے کے بعد کوئی اور نبی آنے کا نہیں۔ اور وہ تفاصیل بھی قرآن کے اصولوں کی طرح ہمیشہ ہمیشہ غیر متبدل قرار پا جائیں گی۔ لیکن زندگی کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ تفاصیل ان کا ساتھ نہیں دے سکیں گی۔ اس طرح تم انہیں نباہ نہیں سکو گے۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسا ہی کیا تھا کہ خواہ مخواہ ایسی تفاصیل پوچھنی شروع کر دیں جن کا غیر متبدل رکھا جانا مقصود نہ تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جب وہ تفاصیل زندگی کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکیں تو وہ ان سے انکار کر بیٹھے۔ اللہ کو چونکہ تمہاری حفاظت مقصود ہے۔ اس لئے تمہارے پوچھنے کے باوجود اس نے ان تفاصیل کو بیان نہیں کیا۔ اس کے حلم کا یہی تقاضا تھا۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ اللہ تعالےٰ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ختم نبوت سے مقصود یہ ہے کہ تم زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے لئے وحی کی راہ نمائی کی طرف آنکھیں لگا کر نہ بیٹھے رہا کرو۔ ان کے متعلق عقل و فکر سے کام لیا کرو۔ اور وحی کے اصولوں کی روشنی میں انہیں

؎ جیسا کہ اس سے پہلے بھی بتایا جا چکا ہے انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہیں جنہیں نشو و نما دینے سے اس کے اندر خاص قسم کی قوت بیدار ہو جاتی ہے جس سے ہو سکتا ہے کہ انسان اس قوت سے بعض ایسی باتیں معلوم کر لے جو ان لوگوں کے لئے ممکن نہ ہوں جنہوں نے اپنی ان صلاحیتوں کو (DEVELOP) نہ کیا ہو اس ذریعہ معلومات کو وجدان یا (INTUTION) کہتے ہیں۔ لیکن یہ علم نہ خدا کی طرف سے براہ راست حاصل شدہ ہوتا ہے نہ اسے وحی یا نبوت سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ یہ ایک نفسی چیز ہے اسے دین سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا حتیٰ کہ اس کے لئے مسلمان ہونے کی بھی شرط نہیں ہوتی جو انسان چاہے ان صلاحیتوں کو نشو و نما دے سکتا ہے۔

خود متعین کیا کر دیتی وہ تفاصیل تھیں جن کے متعین کرنے کے لئے خود نبی اکرمؐ کو کہا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹) یعنی ان کا فیصلہ اپنی جماعت کے مشورے سے کیا کرو۔ لیکن بعد کے مسلمانوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا اور جن تفاصیل کو خدا نے دانستہ غیر متعین چھوڑا تھا، انہیں متعین کر کے ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہی جو اس قوم کی صورت میں ہوا تھا جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے تم اس بات پر غور کرو کہ ہماری شریعت میں (یعنی ان تفاصیل میں جنہیں قرآن نے غیر متعین چھوڑا تھا) سینکڑوں باتیں ایسی ہیں جو زمانے کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں۔ ہمارے ارباب شریعت کا تقاضا ہے کہ وہ زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دیں یا نہ دیں، انہیں اسی طرح سے ماننا اور اسی طرح سے عمل کرنا ہوگا۔ کیونکہ (بقول ان کے) وہ شریعت الٰہیہ کے احکام ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں خود دین کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا ہو رہے ہیں (اور اگرچہ وہ ابھی علانیہ اس کا اظہار نہیں کرتے لیکن) دل میں وہ خود دین کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کر رہا ہے۔ تمہیں یاد ہے گزشتہ عید پر خالد نے کیا کیا تھا؟ پچھلی عید پر اسے جو جوتا لے کر دیا گیا تھا۔ وہ اس کے پاؤں میں تنگ ہو گیا تھا (اس کا پاؤں ماشاء اللہ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ اور جوتا ویسے کا ویسا رہتا ہے۔ اس کی امی کا اصرار تھا کہ وہ وہی جوتا پہنے چنانچہ اس نے طوعاً و کرہاً اس وقت تو وہ جوتا پہن لیا۔ لیکن واپسی پر اسے عیدگاہ میں کھو آیا۔ میری آنکھیں سلیم! اس قصے کو دن بدن قریب آتے دیکھ رہی ہیں۔ ہم اپنے نوجوانوں کو تنگ جوتا پہننے پر مجبور کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کرتے کہ جوتے کو کلبوت دے کر پاؤں کے مطابق بنا دیں۔ وہ اس وقت کسی نہ کسی مجبوری کی بنا پر اس جوتے کو پہنے ہوئے ہے۔ لیکن معلوم نہ کس وقت اسے اتار کر کھڈ میں پھینک دے۔ وہ ایسا کرنے میں سچا ہوگا۔ ایسے جوتے کو جس سے پاؤں ہر وقت شکنجے میں جکڑے رہیں۔ کوئی کب تک پہنے رکھ سکتا ہے! تمہیں یاد ہے تمہاری نانی اماں ایسے موقعہ پر کیا کہا کرتی تھی؟ وہ کہا کرتی تھی "بھاڑ میں جائے وہ سونا جو کانوں کو کھائے"۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ کسی دن اس مثل ہی کو نہ دہرا دے! دین اس لئے آیا تھا کہ انسانی زندگی میں آسانیاں پیدا کرے۔ رسول اللہ کی بعثت کا مقصد قرآن نے یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) وہ اس بوجھ کو اتار دے گا جس کے نیچے انسانیت دبی چلی آ رہی ہے۔ وہ ان زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دے گا جس میں انسان (اپنی خود ساختہ شریعت اور نظام کے ہاتھوں) جکڑا ہوا ہے۔ ختم نبوت نے اس مقصد کو پورا کر دیا۔ اس نے انسان کو صرف ان حدود اللہ (BOUNDARY LINES) کا پابند رکھا۔ جو وحی کے غیر متبدل اصولوں نے اس کے معاشرے کے اردگرد کھینچی تھیں۔ ان حدود کے اندر اسے آزاد چھوڑ دیا کہ وہ اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق جزئیات خود متعین کرے۔ لیکن ہماری خود ساختہ شریعت نے ان ٹوٹی ہوئی زنجیروں کے ٹکڑوں کو ایک لیک کر کے مرکانِ عقیدت سے اٹھا لیا۔ اور انہیں پہلے سے بھی زیادہ سخت زنجیروں میں ڈھال کر ملت کو ان میں جکڑ دیا۔ اور اس طرح اس امت کو جس نے اقطار السموٰت والارض سے بھی آگے نکل جانا تھا ایسا زمین گیر بنا دیا کہ اس کی گردن ہی اوپر کو نہیں اٹھ سکتی۔ قرآن کے الفاظ میں إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ. وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (۳۶/۸-۹) گردن میں طوق و سلاسل اور آگے پیچھے دیواریں

جن سے کچھ نظر ہی نہ آئے۔ ہم نے ان زنجیروں میں خود اپنے آپ ہی کو نہیں جکڑا بلکہ قرآن کو بھی اپنی خود ساختہ تفاسیر کے تابع رکھ کر اس بری طرح سے جکڑ دیا کہ وہ ایک قدم بھی آزادانہ نہیں اٹھا سکتا۔ تم نے سلیم! اس دن اس بھینس کو دیکھا تھا جو اس بری طرح سے چل رہی تھی۔ اس کے مالک نے کیا یہ تھا کہ ایک چھوٹی سی رسی ایک طرف اس کے سینگ سے اور دوسری طرف اس کے پاؤں سے باندھ دی تھی۔ رسی اتنی چھوٹی تھی کہ اس سے اس بیچاری کا سر بالکل پاؤں کے قریب آگیا تھا۔ وہ اس رسی سے اس بری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ کہ وہ ایک قدم بھی اپنی پوری رفتار سے نہیں اٹھا سکتی تھی۔ وہ اسی رفتار سے چل سکتی تھی جس رفتار سے اس کا مالک چاہتا تھا کہ وہ چلے۔ اس کی ساری

قرآنِ مہجور

آزادی سلب ہو چکی تھی۔ اس انداز سے جکڑے ہوئے جانور کو عرب مہجور کہتے ہیں۔ مہجور کے اس مفہوم کو سامنے رکھو اور پھر قرآن کریم کی اس آیت کا مطلب سمجھو جس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی اکرم خدا سے فریاد کریں گے کہ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰) اے میرے نشوونما دینے والے، میری قوم نے اس قرآن کو مہجور بنا رکھا تھا۔ ایسا کرنے والوں کے متعلق اس سے اگلی آیت میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ۔ اور اس طرح ہم نے مجرمین کے طبقہ میں سے ہر نبی کے دشمن بنا دیئے۔ یعنی ایسا کرنے والے مجرم ہیں اور نبوت کے دشمن۔ اس کا علاج کیا ہے؟ یہ کہ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا (۲۵/۳۱) خدا کی راہ نمائی اور نصرت کو کافی سمجھا جائے۔ اور انسانوں کی ان خود ساختہ جکڑبندیوں کو توڑ کر رکھ دیا جائے۔ جنہیں وہ شریعت خداوندی کے نام سے آگے بڑھاتے ہیں اور جن سے نجات دلانے کے لئے حضور خاتم النبیین تشریف لائے تھے۔

الحاصل

تصریحات بالا سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی سلیم! کہ

(۱) کائنات میں ہر شے کی طرف خدا کی وحی براہ راست ہوتی ہے۔ یعنی ہر شے کا قانون زندگی اس شے کی فطرت میں رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ قانون اس شے کی فطرت کہلاتا ہے۔

(۲) جس شے کی فطرت میں کوئی قانون رکھ دیا جائے وہ اس قانون کی اطاعت پر مجبور ہوتی ہے۔ اسے اس سے سرتابی کا اختیار ہی نہیں تا یہ وجہ ہے کہ کائنات میں کسی شے کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں۔

(۳) انسان کی تخلیق دیگر اشیائے کائنات سے بالکل مختلف انداز میں ہوئی ہے اسے اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا قانون زندگی اس کی فطرت کے اندر نہیں رکھا گیا۔ اس کی طرف خدا کی وحی حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے آتی رہی ہے۔ یعنی اس نوع کے ایک منتخب فرد کی وساطت سے دیگر افراد تک وحی پہنچائی جاتی رہی ہے

(۴) وحی کے اس منفرد طریق کے علاوہ، انسان کو عقل و بصیرت بھی عطا کی گئی ہے۔ وحی کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی عقل کی راہ نمائی کرے۔

(۵) جس قدر انسان کی عقل خام تھی اسی قدر وحی خداوندی زیادہ سے زیادہ تفاصیلی احکام دیتی تھی۔ جوں جوں اس کی عقل میں پختگی اور علم میں وسعت آتی جاتی تھی۔ یہ تفاصیل کم ہوتی جاتی تھیں۔ تا آنکہ

(۶) وہ دور آگیا جس میں انسانی عقل بلوغت کی حد میں داخل ہوگئی۔ اس وقت خدا کی طرف سے آخری وحی آئی۔ اور نوع انسانی کی مکمل

راہ نمائی کے لئے جو کچھ دیا جانا مقصود تھا، اسے اصولی طور پر قرآن کے اندر محفوظ کر کے وحی کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کے اصولوں کی روشنی میں مختلف زمانوں کے تقاضوں کے مطابق تفاصیل کا مرتب کرنا انسان کی عقل و بصیرت پر چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ یہ تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ تمام خارجی کائنات کے مقابلہ میں انسان کی حیثیت منفرد ہے۔ اور ختمِ نبوت کے بعد کاروانِ انسانیت ایک نئی منزل میں داخل ہو گیا ہے۔ جس میں انسان کی خود اعتمادی پر زیادہ سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور اس کی آزادی کو حدود اللہ کے علاوہ کسی اور چار دیواری سے محدود نہیں کیا گیا۔ یہ ہے سلیم! تمہارے سوال کا جواب۔ اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ وہ دیکھو سامنے کی پہاڑی پر سورج کی آخری کرن برف آلود چوٹی کو بوسہ دے کر صبح تک کے لئے رخصت ہو گئی۔ ان چوٹیوں پر شام و سحر کے یہ مناظر کس قدر پر کیف ہیں اور جو کچھ غالب نے کہا تھا اس کی کیسی حسین تفسیر کہ

وداعِ وصل جاں گانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

پرویز جون ۱۹۵۶ء

اسبابِ زوالِ اُمت

دوسرا ایڈیشن

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا! محترم پرویز صاحب کا وہ مقالہ جس نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔
محترم مؤلف کی نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔

ضخامت ۱۷۲ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش صرف دو روپے (علاوہ محصولِ ڈاک)

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۱۵۹/۳۔ ایل۔ پی۔ ای سی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۲۹

سلسلۂ اصلاح وتذکیر (محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

۴

[اس مضمون کی گذشتہ تین اقساط میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں والدین کے واجبات کا بیان ہنوز جاری ہے۔ موجودہ قسط میں والدین کی ذمہ داریوں پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے]

اولاد

اولاد کی تعلیم وتربیت

اس موضوع پر مختصراً پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ مگر یہاں پھر خاص طور پر یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اولاد کی تعلیم وتربیت ہمیں کس انداز پر کرنی چاہیئے۔ اس ذیل میں ہمیں اصولی طور پر یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ تعلیم وتربیت وہی مناسب ہو سکتی ہے جس میں اولاد کی صلاحیتیں برگ وبار لا سکیں اور وہ مجلس کرنہ رہ جائیں۔ والدین کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی اولاد نہ صرف اولاد بلکہ گھر کے تمام افراد کی دیکھ بھال رکھیں کہ وہ کہیں ایسے خیالات یا ایسے اعمال میں گرفتار نہیں جو ان کی صلاحیتوں کو جھلسا کر رکھ دیں یعنی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں وہ ایسی راہ پر تو نہیں پڑ گئے جو ان کے متوقع امکانات کو تہس نہس کر ڈالیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا ..... (۶۶)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔

اس لئے ہمیں اولاد کی تربیت نہایت غور وپرداخت سے کرنی چاہیئے۔ اور سب سے پہلے ہمیں صحیح طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ہمارے لڑکے یا لڑکی میں کس قسم کی صلاحیتیں ہیں۔ اور وہ کیا کچھ بن سکتے ہیں۔ ایک ایسے بچے کو جو ایک اچھا انجینیر بن سکتا ہے فلسفہ کی تعلیم دلوانا اس کی مضمر صلاحیتوں کو نشوونما دینا نہیں بلکہ ان کو گھن لگا دینا ہے۔ ایسے ہی ایک ایسے لڑکے یا لڑکی کو جو ایک اچھا ڈاکٹر یا ڈاکٹرنی بن سکتی ہے فوج میں بھرتی کرا دینا اس کی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دینا ہے۔ ایسے ہی ایک ایسے بچے کو جو ایک بہترین صناع بن سکتا تھا کھیتی باڑی کے

کام میں لگانا اس پر انتہائی ظلم ہے۔ بہرحال ہمیں اپنی اولاد کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ کرکے ان کی ایسی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا چاہیئے جو ان کی صلاحیتوں سے مطابقت رکھتی ہوں اور جس میں ان کی صلاحیتیں نشو و نما پا سکیں اور وہ محبوس کرنہ رہ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں ان کی اخلاقی تربیت سے بھی غافل نہ ہونا چاہیئے۔ ایک مسلمان کی زندگی کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ قانون خداوندی سے ہم آہنگ زندگی بسر کرے۔ مگر مسلمان کی زندگی کا منتہائے مقصود اتنا ہی نہیں کہ خود قانون خداوندی کے ہم آہنگ ہو جائے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی اس کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بھی ایسا ہی بنانے کی کوشش کرے۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا

لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (۲۵/۷۴)

اور اللہ کے نیک بندے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی بیویوں اور اولادوں میں سے ایسی بیویاں اور اولادیں عطا فرما جن سے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہو۔ اور ہمیں ان لوگوں کا امام اور پیشوا بنا جو قانون خداوندی سے ہم آہنگ رہنے والے ہوں۔

لہذا ہمیں قدم قدم پر اپنی زندگی اور اپنی اولاد کی زندگیوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے کہ وہ قانون خداوندی سے ہم آہنگ ہو کر گذر رہی ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں گذر رہی ہیں تو فوراً اس کی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ جلد سے جلد قانون خداوندی سے ہم آہنگ بن جائیں۔ اس سلسلے میں ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ قانون خداوندی کے دو گوشے ہیں۔ ایک گوشہ جسمانی نشو و نما سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دوسرا گوشہ انسانی ذات (PERSONALITY) کی نشو و نما سے تعلق رکھتا ہے۔ جسم کے لئے جہاں خدا نے یہ قانون رکھا ہے کہ اس کی نشو و نما لینے سے ہوتی ہے وہیں انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے یہ قانون بھی رکھا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دینے سے ہوتی ہے۔ اس لئے اپنی اور اپنی اولاد کی زندگی کو خدا کے قانون سے ہم آہنگ رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اولاد کو شروع ہی سے دینے کی عادت ڈالی جائے۔ اپنے حالات کے مطابق اس کے لئے بہتر طریقے آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر عرض کیا جا سکتا ہے کہ آپ گھر میں کوئی چیز لائیں تو بچوں کے ہاتھ سے سب کو دلوایئے غرباء کو تقسیم کرایئے۔ اور اس کے بعد ان سے کہیئے کہ وہ خود کھائیں۔ اس طرح بچے شروع ہی سے لینے کے بجائے دینے کے عادی بن جائیں گے۔ اور آئندہ زندگی میں یہ عادت ان کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔

اولاد کی تربیت بڑی کٹھن ذمہ داری ہے

سطور بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت کوئی آسان کام نہیں ہے پہلے صحیح طور پر یہ اندازہ کرنا کہ اس بچہ میں کیا کیا صلاحیتیں ہیں اور اس کی کن کن صلاحیتوں کو نشو و نما دینا ہے، اور پھر ان کی نشو و نما کا انتظام کرنا اور ان صلاحیتوں کو صحیح معنے میں پروان چڑھانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے جسے یوں ہی سرسری طور پر کھیلا جائے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں صدیوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ اولاد پیدا کرنے سے پہلے ان ذمہ داریوں کا صحیح طور پر احساس پیدا کرنا چاہیئے۔ اور یہ احساس پیدا کرنے کے بعد اتنی ہی اولاد پیدا کرنی چاہیئے۔ جتنی اولاد کی ہم صحیح طور پر تربیت کر سکتے ہوں۔ اگر ہم دو بچوں کی تربیت کر سکتے ہیں اور اس کے بعد ہم چار بچے پیدا کر لیتے ہیں۔ تو یہ دو بچے زیادہ پیدا کرکے نہ صرف ہم اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں بلکہ ان چاروں بچوں پر بھی ظلم کرتے ہیں

ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ اور اپنی ذمہ داریوں کا نہ احساس کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان مفاسد کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ جو اس ذمہ داریوں کے عدم احساس سے ہمارے معاشرے میں برابر پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ صرف پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ بلکہ ایک نہایت ہی گھناؤنا ناسور بنتے جا رہے ہیں۔

اولاد پیدا کرنا کارِ ثواب نہیں

بدقسمتی سے ہمارے علماء نے مسلمانوں کو صدیوں سے یہ سبق رٹا رکھا ہے کہ دھڑا دھڑ اولاد پیدا کرتے چلے جاؤ کیونکہ یہ کارِ ثواب ہے۔ اور اس کے لئے انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو آڑ بنا لیا ہے کہ آپ نے فرمایا تھا۔

شادی بیاہ کرو اور نسل بڑھاؤ میں تمہاری کثرت تعداد سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔

معلوم نہیں رسول اللہ صلعم کی طرف اس ارشاد کی نسبت کہاں تک صحیح ہے۔ اور اگر نسبت صحیح بھی ہے تو معلوم نہیں کہ آپ نے کن احوال و ظروف میں ایسا فرمایا ہوگا۔ اس کو مطلقاً ایک قانون بنا کر کارِ ثواب قرار دینا بہت بڑی جسارت ہے۔ قرآن کریم کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ دیکھ چکے ہیں کہ اولاد پیدا کرکے آپ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ اگر آپ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اور استعداد اپنے اندر نہیں پاتے تو خواہ مخواہ اولاد پیدا کرتے چلے جانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ کیا آپ خیال بھی کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم خدانخواستہ یوں اولاد پیدا کرکے اس کی مٹی خراب کرنے کا حکم دے سکتے تھے۔ ہرگز نہیں!! بہرحال آپ کو اتنی اولاد ہی پیدا کرنی چاہیئے جتنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت کا آپ انتظام کر سکتے ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں۔

تربیت کی ایک حد ہے

اولاد کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا اور ان کی صحیح تعلیم و تربیت کرنا ماں باپ کا فریضہ ہے۔ ان کی جسمانی تربیت بھی اور علمی اور اخلاقی تربیت بھی۔ لیکن اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ ماں باپ ہونے کی وجہ سے ہم اپنی اولاد کی زندگیوں کے مالک بن جائیں کہ انھیں ہر خیال اور ہر کام میں اپنا پابند بنا لیں۔ بلاشبہ جب تک اولاد سن شعور کو نہیں پہونچ جاتی آپ اپنی صوابدید کے مطابق انھیں چلا سکتے ہیں۔ ان کی عقل و شعور چونکہ ابھی پختگی کو نہیں پہنچی۔ اس لئے انھیں بھی اپنے عقل و شعور سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ اور آپ ان سے اپنے احکام کی تعمیل کرا سکتے ہیں۔ لیکن جب وہ سن شعور کو پہنچ جائیں تو آپ اب انھیں اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ آپ ان کی انسانی حریت فکر و عمل پر چوکیدار نہیں بٹھا سکتے۔ سن شعور کو پہنچ جانے کے بعد وہ اپنے افعال و اعمال کے خود جواب دہ ہیں۔ اور انھیں اپنے متعلق خود فیصلے کرنے کا حق ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا
فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ (۴)

اور یتیم بچوں کی آزمائش کرتے رہا کرو۔ حتیٰ کہ جب وہ نکاح کی عمر (بلوغ) کو پہنچ جائیں تو اس کے بعد اگر تم ان میں رشد (معاملات پر غور و فکر کرنے اور فیصلہ کرنے کی قابلیت) کو محسوس کرو تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو۔

بہرحال سنِ شعور کو پہنچ جانے کے بعد ہم انہیں مشورہ تو دے سکتے ہیں۔ مگر اپنے مشورے پر جبراً عمل نہیں کرا سکتے۔ اس موضوع پر پچھلی اقساط میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے زیادہ تفصیل سے یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اولاد کی شادی کرنا

قرآنی نقطہ نگاہ سے شادی ایک مرد اور ایک عورت کا باہمی معاہدہ ہے۔ جس میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور دکھ درد میں ایک دوسرے کے شریک ہونے کا عہد کرتے ہیں۔ بلاشبہ اس معاہدہ میں طرفین میاں اور بیوی ہی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ معاملہ چونکہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اس لئے ماں باپ کو چاہیئے کہ وہ اس سلسلہ میں اولاد کی ہر ممکن امداد کریں۔ اور اپنے جیون کا ساتھی تلاش کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ انہیں اس سلسلہ میں والدین کی طرف سے جس قسم کی امداد کی ضرورت ہو وہ انہیں یہ امداد مہیا کریں (اس موضوع کا اصل مقام تو وہ ہوگا جہاں میاں بیوی کے تعلقات سے بحث کی جائے گی۔ لیکن سرِدست آپ اتنا سمجھ لیجئے کہ) اس پورے ڈرامہ میں ماں باپ کو بالکل فیروں کی طرح تماشائی نہیں بننا چاہیئے بلکہ اپنے مشوروں اور اپنی نصیحتوں کی مدد سے اولاد کے اس کام کو آسان تر بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر اس سلسلہ میں اولاد کو والدین کی مالی امداد کی ضرورت ہو تو انہیں اس سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن شادی کے معاملہ میں آخری فیصلہ لڑکے اور لڑکی ہی کا ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انہیں ہی آپس میں زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کرنا ہے۔ اس باب میں والدین کو ان کا ممد و معاون بننا چاہیئے۔ ان کے راستے میں روک بن کر حائل نہیں ہونا چاہیئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ میں جب وہ مدین پہنچے ہیں اور پانی کے گھاٹ پر دو لڑکیوں کو انہوں نے دیکھا ہے (اس واقعہ کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے) جب لڑکیاں حضرت شعیب علیہ السلام سے یہ واقعہ بیان کرتی ہیں۔ اور وہ اس واقعہ کے بین السطور سے یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کی اصل خواہش کیا ہے تو وہ ان کی راہ میں حائل نہیں ہوتے بلکہ ایک بزرگ خاندان کی طرح خود آگے بڑھ کر یہ کام انجام دیتے ہیں۔

قَالَ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هَاتَیْنِ عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ..... (۲۸/۲۷)

شعیبؑ نے کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کی تم سے شادی کر دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال تک میرے گھر کا کام کاج کرتے رہو گے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ لڑکی کی خواہش کیا ہے۔ قرآن نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے کہ آپ کی ایک لڑکی کس طرح لجاتی شرماتی حضرت موسیٰ کو بلانے جاتی ہے۔ اور پھر کس طرح ان کی ملازمت کے لئے باپ سے سفارش کرتی ہے اس کے انداز بیان سے بھی یہ چیز جھلکتی ہے کہ حضرت شعیب کی اس صاحبزادی کا منشاء کیا تھا۔ بہرحال والدین کو جب اولاد کا منشاء معلوم ہو جائے تو پھر انہیں بزرگ خاندان بن کر اس فریضہ کو سرانجام دے دینا چاہیئے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس واقعہ سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر لڑکی کا باپ لڑکے والوں سے لڑکی کا جو معاوضہ لیتا ہے۔ وہ قرآنی نقطۂ نظر سے صحیح ہے۔ کیونکہ یہاں حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰ سے یہ معاوضہ مانگا ہے کہ وہ آٹھ سال تک ان کے گھر کا کام کاج کریں۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ لڑکی کا معاوضہ ہی تھا۔ مگر درحقیقت اس واقعہ سے اس پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ قرآن کریم کے انداز بیان سے ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ گھر میں یہ دونوں لڑکیاں ہی تھیں۔ گھر کے کام کاج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حضرت شعیبؑ کا کوئی کام کاج کریں گے بلکہ جو کام کاج تھا وہ ان لڑکیوں ہی کا تھا۔ کیونکہ وہ ہی اس گھر کی مالک بننے والی تھیں۔ یہ شرط اگرچہ حضرت شعیبؑ پیش کر رہے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی دوسری تصریحات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ شرط حضرت شعیبؑ کی نہیں بلکہ ان کی صاحبزادی کی تھی جو حضرت شعیبؑ نے اپنی طرف سے پیش کی تھی اور لڑکی کو یقیناً یہ حق حاصل ہے کہ وہ شادی کے وقت کوئی مناسب شرط عائد کرے۔ اس کے علاوہ یہ شرط کوئی ایسی شرط بھی نہیں ہے۔ جس سے معاوضہ کے جواز پر دلیل لائی جائے۔ اگر یہ شرط نہ بھی ہوتی تب بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہی کچھ کرنا تھا کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت شعیبؑ کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کے کوئی نرینہ اولاد بھی نہیں تھی۔ گھر میں صرف دو لڑکیاں تھیں اور دونوں کنواری تھیں۔ جب تک کہ بوڑھے خسر اور باپ کی دیکھ بھال کے لئے اس گھر میں دوسرا داماد نہ آجائے اس وقت تک حضرت موسیٰ اور ان کی اہلیہ اپنے خسر یا باپ اور ایک (غالباً چھوٹی) بہن کو تنہا چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے۔ یہ شرط اگر نہ بھی کی جاتی تب بھی حضرت موسیٰ کا خود یہ فریضہ ہو جاتا تھا کہ شادی کر لینے کے بعد وہ خود ہی کچھ کریں۔ ایسی صورت میں اس واقعہ سے اس مذموم رسم کے لئے وجہ جواز نکالنا بہت بڑی جسارت ہوگی۔

والدین اپنے گذارے کے لئے اولاد سے لے سکتے ہیں

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے قرآنی معاشرہ میں سرمایہ اندوزی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی محنت کے حاصل کو کھلا رکھے۔ اور جہاں ضرورت دیکھے وہاں اس کو صرف کر دے کیونکہ اسلامی معاشرے میں انسان اپنی محنت کے حاصل کا مالک نہیں بلکہ امین ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں سے اتنا ہی لینے کی اجازت ہے جتنے کی اسے ضرورت ہو۔ اس کے بعد جو کچھ بچ جائے۔ وہ ان لوگوں کا حق ہوتا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق حاصل نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں میں سب سے مقدم ترین حق والدین کا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲/۲۱۵)

اے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا کچھ مفاد عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دیں۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ جو اموال تم کو مفاد عامہ کے لئے رکھنے چاہئیں وہ والدین، قریبی رشتہ دار، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لئے ہیں اور جو کچھ بھلائی تم کرتے ہو خدا اسے بخوبی جانتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اسلام میں لینے اور دینے کا مدار ضرورت پر ہے۔ اگر والدین ضرورت مند ہوں اور اولاد کے پاس اس کی اپنی ضروریات سے زیادہ ہو تو والدین کو قطعاً یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی اولاد سے گذارہ کے لئے لے لیں۔ لیکن اگر انہیں ضرورت نہیں ہے یا اولاد کے پاس اپنی ضروریات سے زیادہ نہیں ہے تو والدین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خواہ مخواہ اولاد کو تنگ کریں۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ضرورت اور احتیاج سے قطع نظر اولاد کا یہ فریضہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ بطور ٹیکس کے والدین کو ادا کرتے رہیں خواہ ان کو ضرورت ہو یا نہ ہو۔ یا اولاد کے پاس اپنی ضروریات سے کچھ زیادہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ تصور قطعاً غلط اور غیر قرآنی ہے۔

مائدرماں نہیں ہوتی

اسی سلسلہ میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ والدین بلا وجہ اپنے اخراجات بڑھا لیتے ہیں۔ اور پھر اولاد کو مجبور کیا جاتا ہے کہ ان اخراجات کے لئے ان کو رقم مہیا کریں۔ کچھ لوگ نئی نئی شادیاں رچا لیتے ہیں۔ اور اولاد کے ذہن میں یہ چیز جمانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جس نے شادی کی ہے۔ وہ بھی ان کی ماں ہے۔ اور اس کی ضروریات کی کفالت بھی ان کے ذمہ واجب ہے۔ حالانکہ قرآن کی رو سے یہ سوتیلی ماں اگرچہ زبان اور محاورے کے اعتبار سے ماں ہی کہی جاتی ہے۔ مگر قرآن کی رو سے یہ ماں نہیں ہوتی۔ زبان سے کسی کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔ ماں وہی ہوتی ہے جو خود اسے پیدا کرتی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ۚ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا اللّٰٓئِيْ وَلَدْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ (۵۸/۲)

جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کر لیتے ہیں (زبان سے انہیں ماں کہہ دیتے ہیں) ان سے وہ ان کی مائیں نہیں بن جاتیں۔ ان کی مائیں تو صرف وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ یہ لوگ بہت ہی بری اور بہت ہی غلط بات کہہ دیتے ہیں۔ بہرحال خدا بڑا معاف کرنے والا اور سامانِ حفاظت عطا کرنے والا ہے۔

بہرحال ایسی ماؤں کی ذمہ داری اولاد پر نہیں ہے۔ نہ وہ ان کی مائیں ہوتی ہیں۔ ایسی ماؤں کو قرآن نے کہیں ماں نہیں کہا۔ قرآن نے ان کو

مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۲۲/۴)

وہ عورتیں جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کر لیا ہو۔

کہا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے اخراجات بڑھا کر اولاد کو تنگ کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر والدین کو ضرورت ہو یا اس قسم کی ماں ضرورت مند ہو اور اولاد کے پاس اس کی ضروریات سے زیادہ ہو تو والدین (والدین کی حیثیت سے) اور اس قسم کی مائیں (ماں ہونے کی حیثیت سے نہیں البتہ رشتہ دار ہونے کی حیثیت سے) گذارہ کے لئے بقدر ضرورت اولاد سے لے سکتے ہیں۔

اولاد پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے

عام طور سے دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ کثرتِ اموال اور کثرتِ اولاد پر انسانوں کو گھمنڈ اور غرہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اموال اور اولاد کوئی گھمنڈ یا غرور کی چیزیں نہیں ہیں۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو مال آنی جانی چیز ہے۔ اور اولاد میں انسان کی اپنی ہنرمندی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہزاروں آدمی دنیا میں ایسے ہیں جو اولاد کو ترستے

رہتے ہیں۔ اور اس کے لئے ہر ممکن جتن بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان کی گود ہری نہیں ہوتی۔ تو ایسی چیزوں پر فخر و ادعا گھمنڈ کے کوئی معنی نہیں، جو آنی جانی چیزیں ہوں یا جن کے ہونے یا نہ ہونے میں انسان کی اپنی ہنرمندی کو کوئی دخل نہ ہو۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ
أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۝ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝ (۶۸/۱۰-۱۴)

ایسے تمام لوگوں کی پیروی نہ کرو جو بہت قسمیں کھانے والے بے قدر اور ذلیل ہوں۔ طعنہ دینے والے اور چغلخوریاں کرنے والے ہوں۔ بھلائی سے روکنے والے۔ حد سے تجاوز کر جانے والے اور تھک کر پیچھے رہ جانے والے ہوں۔ اجڈ ہوں اور ان سب اوصاف کے بعد یہ بھی کہ بدنام ہوں۔ یہ سارے اوصاف ان میں محض اس وجہ سے ہوں کہ وہ مالدار ہیں اور صاحبِ اولاد ہیں۔

اولاد باعثِ عذاب بھی ہوتی ہے

ایسے لوگوں کے لئے ان کی اولاد بسا اوقات ایک مصیبت اور عذاب بن جاتی ہے۔ انہیں دنیا میں بھی امن اور چین نصیب نہیں ہوتا۔ چونکہ ایسے لوگ خود بھی صحیح اقدار پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنی اولاد کی تربیت بھی صحیح طور پر نہیں کرتے۔ اس لئے ان کی اولاد قدم قدم پر اپنے والدین کے لئے مشکلات ہی پیدا کرتی رہتی ہے اس مضمون کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے کہ

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ۝ (۹/۵۵)

اے پیغمبرِ اسلام! آپ کو ان لوگوں کے اموال و اولاد سے تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے قانون کے مطابق خدا انہیں ان چیزوں کے ذریعے سے دنیوی زندگی میں عذاب دینا چاہتا ہے۔ اور یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی جانیں حالتِ کفر ہی میں نکلتی ہیں۔

آیت بالا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کافروں کو اس دنیا میں اگر اموال و اولاد کی فراوانی سے نوازا جاتا ہے تو اس لئے کہ یہ ان کے لئے عذاب بن جائیں۔ اور مومنین کو ان دونوں کی کثرت سے نوازا جاتا ہے تو اس لئے کہ یہ چیزیں ان کے لئے رحمت و نعمت کا باعث بن جائیں جیسا کہ عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ مومن اور کافر ہمارے ہاں دو قوموں کا نام پڑ گیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں نام نہیں ہیں بلکہ صفات ہیں۔ مومن وہ ہے جو حق کی دی ہوئی اقدار پر یقین رکھتا ہو۔ اور ان کے مطابق اپنی اولاد کی صحیح تربیت کرتا ہو۔ اور کافر وہ ہے جو حق کی بتلائی ہوئی اقدار پر یقین کامل نہ رکھتا ہو اور ان اقدار کے مطابق اپنی اولاد کی صحیح تربیت نہ کرتا ہو۔ لہٰذا اگر کوئی مدعیٔ ایمان ایسا ہو جیسا کہ ہم ہیں۔ جو حق کے اقدار پر ایمانِ کامل نہ رکھتا ہو۔ اور اپنی اولاد کی تربیت ان اقدار کے مطابق نہ کرتا ہو تو اس کی اولاد بھی دنیوی زندگی میں اس کے لئے وبالِ جان بن جائے گی۔ باقی رہے وہ جو سرے سے ان اقدار کو مانتے ہی نہیں سو وہ اپنے مال اور اولاد کے گھمنڈ پر صحیح راہ سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اور یہی چیز ان کے لئے ہزار مصیبتوں کا موجب بن جاتی ہے۔

اولاد قربِ خداوندی کا ذریعہ نہیں

قربِ خداوندی کے معنی ہیں انسان کا اپنی خودی (PERSONALITY) کو نشوونما دے کر مستحکم کر لینا اور خدائی صفات (صبغۃ اللہ) کو اپنے اندر جلوہ گر کر لینا۔ ظاہر ہے کہ اس چیز کا تعلق اولاد یا اس کی کثرت سے قطعاً نہیں ہے جیسے انسان کے جسم کی نشوونما کے لئے خدا کی طرف سے ایک قانون مقرر ہے ایسے ہی انسانی خودی کی نشوونما کے لئے بھی ایک قانون مقرر ہے۔ جسم کی نشوونما صحیح تغذیہ پر موقوف ہے۔ مناسب غذائیں مناسب اوقات پر اگر جسم کو ملتی رہیں تو وہ نشوونما پاتا رہتا ہے اور اگر اسے صحیح غذائیں اپنے وقت پر نہ مل سکیں تو اس کی نشوونما رک جاتی ہے ایسے ہی انسان کی خودی (PERSONALITY) کی نشوونما اس پر موقوف ہے کہ انسان عام انسانیت کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ دیتا چلا جائے۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۝ (۹۲/۱۷-۱۸)

تپتی ہوئی آگ سے وہی شخص بچایا جائے گا جو قانونِ خداوندی سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو یعنی جو اپنے مال کو انسانیت کی نشوونما کے لئے دیتا چلا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس کے بیچ میں اولاد کہیں نہیں آتی۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ اولاد کی کثرت قربِ خداوندی کا باعث یا اس کا ذریعہ ہے۔ قطعاً غلط ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِنْ نَذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ ۝ (۳۴/۳۴-۳۷)

ہم نے کسی آبادی میں نتائج اعمال سے ڈرانے والے کو نہیں بھیجا مگر اس آبادی کے عیش پسند طبقے نے ہمیشہ یہی کہا کہ جس تعلیم کو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے۔ ہم اسے نہیں مانتے۔ انہوں نے کہا کہ تم دیکھتے نہیں ہمارے ہاں اموال و اولاد کی کس قدر فراوانیاں ہیں۔ ہم پر کوئی عذاب نہیں آسکتا (خدا کو ہمیں عذاب دینا ہوتا تو وہ ہم پر یہ انعامات ہی کیوں کرتا) اے پیغمبر اسلام آپ کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار کا قانون ان لوگوں کیلئے رزق کی وسعتیں کر دیتا ہے۔ جو رزق کو قانونِ خداوندی کے ماتحت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں کے لئے (جو قانونِ خداوندی کے مطابق اسے طلب نہیں کرتے) تنگ کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ تمہارے مال اور تمہاری اولادیں ایسی چیزیں نہیں ہیں جو تمہیں منزلت کے اعتبار سے ہمارا

مقرب بنا دیتی ہوں۔ ہمارا تقرب تو اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو ایمان لائے اور صلاحیت بخش کام کرے۔ یہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں اپنے اعمال کی وجہ سے دوگنا بدلہ ملتا ہے۔ اور یہی لوگ ہوتے ہیں جو بالاخانوں میں امن اور چین کی زندگی بسر کریں گے۔

اولاد و اموال کی کثرت کا تعلق کچھ خدا کے انعام و اکرام یا اس کی خوشنودی و رضا سے نہیں ہے۔ ان چیزوں کا تعلق طبعی قوانین سے ہے۔ جو شخص ان طبعی قوانین کے مطابق ان چیزوں کو طلب کرتا ہے۔ وہ ان کو حاصل کر لیتا ہے اور جو شخص ان قوانین کے ماتحت ان چیزوں کو طلب نہیں کرتا۔ وہ ان سے محروم رہ جاتا ہے۔ لہٰذا کثرتِ اموال اور کثرتِ اولاد کو خدا کے قرب کا ذریعہ سمجھنا (کہ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ) فکر و نظر کا قصور ہے۔ خدائی انعامات و اکرامات کا تعلق انسان کے اپنے اعمال سے ہے۔ اور بس۔

نتائجِ اعمال میں اولاد کچھ کام نہیں آئے گی

ہم نے جیسے کچھ اعمال کئے ہیں ان کے نتائج ہمارے سامنے آجائیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے سنکھیا کھانے والے کو بہرحال موت سے ہم آغوش ہونا ہوگا۔ اگرچہ اس کی دو درجن اولاد ہی موجود کیوں نہ ہو۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ ۚ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۚ یَفْصِلُ بَیْنَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ (۶۰/۳)

قیامت کے دن تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد ہرگز تمہیں کوئی نفع نہیں دینگی۔ خدا ہی تمہارے درمیان میں فیصلہ کرے گا اور اسے خوب معلوم ہے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔

دوسری جگہ ہے

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ (۳/۱۰)

بلاشبہ جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ انھیں ان کے اموال اور ان کی اولادیں خدا کے قانون سے کچھ بھی نہیں بچا سکیں گی۔ یہ سب کے سب جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

اس سے پچھلی قسط میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ نتائجِ اعمال میں والدین بھی اولاد کے کچھ کام نہیں آسکتے۔ اور یہاں آپ نے دیکھ لیا کہ اس خصوص میں اولاد بھی والدین کے کچھ کام نہیں آسکتی۔ البتہ فطری طور پر ہر انسان کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ جیسے یہاں دنیا میں اس کی اولاد اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اُخروی زندگی میں بھی اس کی اولاد اس کے ساتھ ہی رہے۔ مگر یہ خواہش اس قسم کی سنہری آرزوئیں رکھنے سے پوری نہیں ہو سکتی اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ آدمی کی اولاد بھی ایمان کی دولت سے مالا مال ہو۔ اور وہ بھی اسی قسم کے صلاحیت بخش اعمال کرے جیسا کہ اس کے والدین کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ہی رکھے گا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ ۭ كُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا كَسَبَ رَهِیْنٌ ۝ (۵۲/۲۱)

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتی رہی ہے تو ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے۔ اور ان کے اعمال سے کچھ کم نہیں کریں گے۔ ہر شخص اپنے ان اعمال میں پھنسا ہوا ہوگا جو اس نے کئے ہوں گے۔

یہ معیت اس دنیا کے جنتی معاشرہ میں بھی ہوگی۔ اور حیات اخروی کی جنتی زندگی میں بھی۔

اپنی اولاد میں باطل نظام کی شرکت کو گوارا نہ کرو

دنیا کا ہر باطل نظام یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کی سیادت قائم ہو جائے اور دوسری قومیں غیر شعوری طور پر اس کے رنگ میں رنگی جائیں۔ مختلف موقعوں پر اس مقصد کے لئے وہ مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ جہاں وہ سمجھتا ہے کہ پروپیگنڈے کی طاقت سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے وہاں وہ پروپیگنڈے کی مشینری سے یہ مقصد حاصل کرتا ہے اور جہاں اس سے کام چلتا نظر نہیں آتا۔ وہاں وہ طاقت اور قوت کے زور پر ایسے ممالک پر قبضہ جما لیتا ہے جنہیں وہ اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ اور جہاں اس کا بھی امکان نہیں ہوتا۔ وہاں وہ پسماندہ اقوام کے اموال و اولاد میں شرکت اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی کہیں صنعتی ادارے قائم کرتا ہے کہ مشینری اور کارخانے ان کے اور کچا مال پسماندہ ملک کا۔ اور اس طرح جو مال تیار ہو۔ اس میں دونوں شریک ہو جاتے ہیں (یہ اموال میں شرکت ہوئی) کہیں وہ تعلیمی ادارے قائم کرتا ہے یا اس قوم کے ہونہار بچوں کو تعلیم دینے کیلئے بڑے بڑے اسکالرشپ پیش کر کے انہیں اپنے ہاں بلاتا اور تعلیم دیتا ہے۔ اور اس طرح نئی پود کے دل و دماغ کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ کہیں بڑے بڑے سبز باغ دکھاتا ہے اور آئندہ کے لئے خوش آئند وعدے کرتا ہے کہ ہم تمہیں فوجی امداد دیں گے۔ صنعتی امداد دیں گے۔ غرضیکہ ہر زمانہ میں باطل نظام ہائے زندگی اپنے آپ کو مقبول بنانے کے لئے یہ ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ ان سب سے ہمیں چوکنا رہنا چاہیئے۔ موضوع زیر بحث کے ماتحت ہمیں یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اپنی اولاد میں باطل نظام کو شریک کر لینے کا نتیجہ قوم کے لئے تباہ کن ہوگا۔ آنیوالی نسل اس باطل نظام کے رنگ میں رنگی جائے گی اور اپنی ان خصوصیات کو کھو بیٹھے گی۔ جو اس کا مابہ الامتیاز تھیں۔ نتیجہ میں باطل نظام کو زندگی مل جائے گی۔ اور حق نظام کے قیام کی راہ میں نت نئی مشکلات پیش آ جائیں گی۔ اور اس طرح یا تو نظام حق قائم ہی نہیں رہ سکے گا۔ یا وہ کمزور ہو جائے گا۔ اس مضمون کو قرآن کریم نے اس انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ ابلیس سے کہتا ہے۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُم بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ۝ (۱۷/۶۴-۶۵)

ان میں سے جن لوگوں کو تو اپنی آواز (پروپیگنڈہ) سے گھبرا سکے گھبرا لے۔ اور ان پر سوار اور پیادہ فوجیں کھینچ کر لے آ (فوجی غلبہ) اور ان کے اموال اور اولاد میں ان کا شریک ہو جا اور ان سے سبز وعدے کرتا رہ۔ شیطان (باطل نظام) ان سے جو کچھ وعدے کرتا ہے وہ فریب کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ میرے

بندوں پر تیرا کوئی تسلط اور غلبہ نہیں ہوگا۔ اور تیرا پروردگار تیری کارسازی کے لئے کافی ہے۔

بہرحال ہمیں اس پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے کہ ہماری اولادوں میں باطل نظام کسی طرح شریک نہ ہو جائے کہ اگر ہماری آئندہ نسل میں باطل نظام کی شرکت ہوگئی تو اس طرح گویا ہم خود باطل نظام کو اپنی سرزمین میں خوش آمدید کہیں گے۔ اور اس کار حق کو مٹانے یا کمزور کرنے میں بالواسطہ شریک ہو جائیں گے۔

قانون خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اولاد بڑھتی ہے

خدا نے کائناتی دنیا اور خود انسانی دنیا (انفس و آفاق) کے لئے جو قوانین رکھے ہیں اگر ان کی صحیح صحیح پیروی کی جائے۔ تو اس سے نہ صرف خوش حالی اور فارغ البالی نصیب ہوتی ہے بلکہ اس سے اولاد بھی بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ (۷۱/۱۰-۱۲)

میں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ (خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق) اپنے پروردگار سے سامان حفاظت طلب کرو بلاشبہ وہی سامان حفاظت عطا کرنے والا ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو وہ تم پر موسلا دھار بارش برسائے گا اور تمہیں اموال اور اولاد سے تقویت دے گا۔ اور تمہارے لئے باغات اور نہریں پیدا کرے گا۔

کیونکہ قوانین خداوندی کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے انسان کو قلبی اطمینان اور دماغی سکون کے ساتھ ساتھ طبعی توانائیاں، صحت اور خوش حالی حاصل ہو جاتی ہے اور یہ چیزیں انسان کو حاصل ہو جائیں تو پھر اس کا ہر قدم آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہ ہے مختصر طور پر قرآن کے آئینہ میں صحیح تصویر اس تعلق کی جو والدین کا اپنی اولاد کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

تاریخ الامت

جلد پنجم و ششم

از۔ علامہ اسلم جیراجپوری

اس کی چار جلدیں پہلے شائع ہو چکی تھیں۔ اب پانچویں اور چھٹی جلدیں تیار ہو کر آ گئی ہیں۔ پانچویں جلد میں خلافت عباسیہ کا بقیہ حصہ اور چھٹی جلد میں مصر کی مکمل تاریخ آ گئی ہے۔ قیمت جلد پنجم غیر مجلد صرف تین روپے اور جلد ششم دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک) پیشگی خریداران کو آرڈر دینے کی ضرورت نہیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

اسلام کی سرگزشت

(ایرانی لٹریچر)

[گذشتہ اقساط میں اسلام پر دیگر اقوام و ملل کے اثرات کے ذیل میں ان نمایاں اثرات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو ایرانی ادیان ـــــ زردشتیت، مانویت اور مزدکیت نے اسلام پر مرتب کئے تھے۔ حالیہ قسط میں ان اثرات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو ایرانی لٹریچر نے عربی لٹریچر پر مرتب کئے]

دولت ساسانیہ کے عہد میں ایرانیوں کی زبان پہلوی تھی۔ زند جو افستا کی شرح ہے۔ وہ اسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس زبان کی حفاظت پر اس دینی کتاب کا اثر ضرور پڑنا چاہیئے تھا لیکن ہمارے موجودہ عہد تک ایران کی پہلوی زبان کی لٹریری ثروت کی جو دولت ساسانیہ کے عہد اور اسلام کے ابتدائی دور میں ایران میں کافی پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی بڑی مقدار ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ جس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ دین اسلام نے زردشتی دین کو شکست دے کر بالکل اسی طرح اس کا مقام خود حاصل کر لیا۔ جیسے کہ عربی زبان اور عربی حروف نے پہلوی زبان اور پہلوی حروف کا مقام حاصل کر لیا تھا۔ ایرانیوں کی اکثریت کے اسلام میں داخل ہو جانے۔ دین یا دنیا یا معاً دونوں کی خاطر ان کے عربی زبان کو سیکھنے پر مجبور ہونے اور ان کے آتشکدوں کو جو بت پرستی کے شعائر میں سے تھے۔ مسلمانوں کے بنظر استحقار دیکھنے نے ایرانی مذہب اور پہلوی زبان کو آہستہ آہستہ کمزور بنانے کا سامان کیا۔ اور بالآخر بالکل فنا کر دیا۔

تاہم پہلوی زبان کا بہت تھوڑا سا ذخیرہ ہم تک پہنچ سکا ہے کچھ تو مجری کتبات ہیں جن پر پہلوی رسم الخط میں لکھا ہوا ہے جو ان کے بادشاہوں کے نام اور ان کی مختصر تاریخ حیات پر مشتمل ہے۔ ان بادشاہوں کا تعلق ساسانی سلسلہ کے ابتدائی سلاطین سے ہے ـــــ کچھ پہلوی کتابیں ہیں جو اسلامی فتوحات کے زمانہ میں پارسی لوگ اپنے ساتھ لے کر ہندوستان وغیرہ کی طرف بھاگ گئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کتابیں مذہبی ہیں اور ان پارسیوں کے ہاتھوں میں ان کتابوں کے محفوظ رہ جانے کا راز بھی یہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی کچھ غیر مذہبی کتابیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً دولت ساسانیہ کے عہد میں ایرانی قانون کا بڑا حصہ۔ جو شخصی حالات مثلاً شادی بیاہ، ملکیت۔ غلامی وغیرہ کو لے کر سے بحث پر مشتمل ہے۔ نیز ایک کتاب جو مراسلات تحریر کرنے کی صنعت پر مشتمل ہے اس کتاب میں

بتایا گیا ہے کہ مراسلات کو کس طرح شروع کرنا چاہیئے اور کس طرح ختم کرنا چاہیئے۔ نیز مراسلات کے اور رسمی آداب بیان کئے گئے ہیں ایک قدیم پہلوی زبان کی لغت بھی ملتی ہے۔ اور ایک شطرنج کی خیالی تاریخ بھی۔ نیز ایران کے کچھ بادشاہوں کے حالاتِ زندگی سے متعلق کچھ کتابیں بھی۔

البتہ دولت ساسانیہ کے عہد کے اشعار ہم تک نہیں پہنچے ۔۔۔ حالانکہ ایران کے بہت سے بادشاہ کافی عظیم الشان گذرے ہیں اور انہیں اس کی ضرورت بھی کہ شعراء ان کی مدحیں گائیں ۔۔۔ اس سلسلہ میں دونوں احتمالوں کی گنجائش ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے اپنے کمالات کے اظہار کے لئے سنگتراشی، نقاشی، تعمیر اور گانوں پر ہی اکتفا کیا ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ انہوں نے شعرو شاعری بھی کی ہو۔ مگر عربی شاعری اس پر غالب آ گئی۔ اور اس نے اسے مار ڈالا ہو۔ ہمارا رجحان اس دوسرے احتمال ہی کی طرف ہے

اگرچہ ایرانی لٹریچر ہم تک بہت ہی کم پہنچا ہے۔ لیکن بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں مسلم فوج تک بہت سی ایرانی کتابیں پہنچی تھیں۔ چنانچہ ابن قتیبہ اپنی کتاب "عیون الاخبار" میں اکثر کہتے ہیں "ایرانی کتابوں میں ایسا ایسا لکھا ہے" اور یہ کہ "میں نے پرویز کے اس خط میں پڑھا ہے جو اس نے اپنے بیٹے شیرویہ کو لکھا تھا جبکہ وہ اس کی قید میں تھا"؛ نیز کتاب التاج کا مصنف بھی اکثر ایرانی بادشاہوں کے اخلاق، آداب اور ان کی کتابوں کے حوالے دیتا ہے۔

بہرحال ایرانی لٹریچر، عربی لٹریچر پر مختلف جہات سے اثر انداز ہوا (اول) زیادہ تر لوگ جو اسلام میں داخل ہوئے ۔۔۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بتایا ہے ۔۔۔ عربی زبان سیکھنے پر مجبور تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہی ایرانی نسل سے شعراء کا ظہور ہونے لگا تھا۔ دولت امویہ کے عہد میں جو ایرانی شعراء نمایاں نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ ان میں سے زیادہ مشہور زیاد الاعجم[1] گذرا ہے۔ اس کی مقام پیدائش اور مقام نشوونما اصفہان تھا۔ اس کے بعد وہ خراسان چلا گیا۔ اور آخر وقت تک وہیں رہا تا آنکہ وہیں اس کا انتقال ہوا۔ یہ شاعر تھا۔ اور اس کے اشعار پر مخر ہوا کرتے تھے۔ اس کا اعجم اس لئے نام پڑ گیا تھا ۔۔۔ جیسا کہ اغانی میں بیان ہوا ہے۔ کہ اس کا تلفظ اپنے ہم وطنوں کے مطابق تھا۔ اس کی زبان بسہولت عربی الفاظ کو ادا نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہ ۔۔۔ مَا كُنْتَ تَصْنَعُ ۔۔۔ کو مَا كُنْتَ تَسْنَعُ کہا کرتا تھا۔ اس کی شعر گوئی چونکہ عربی آموزی پر مبنی تھی۔ اہل زبان کی طرح اس کو زبان پر قدرت تامہ حاصل نہیں تھی۔ اس لئے اکثر اشعار میں نحوی غلطیاں کر جاتا تھا۔ مثلاً اس کا ایک شعر ہے ؎

إِذَا قُلْتُ قَدْ أَقْبَلَتْ أَدْبَرَتْ
كَمَنْ لَيْسَ غَادٍ وَلَا سَارٍ ا بَحُرٌ

رجب میں کہتا ہوں کہ وہ آ گئی ہے تو وہ پلٹ جاتی ہے۔ اس آدمی کی طرح جو نہ صبح کو آنیوالا ہو نہ شام کو آنے والا)

---

[1] ایک دوسری رائے بھی ہے جو زیاد الاعجم کے عجمی ہونے کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے بارہ میں مختلف اقوال اور ان کا ترجمہ ص ۹۹ جلد ۲، اغانی میں دیکھنا چاہیئے۔

حالانکہ قاعدے کے اعتبار سے اسے غادِیًا دکا سا ایجام کہنا چاہیے تھا۔[1]

ابن لیار نسائی[2] کا خاندان بھی ایران کے ان مشہور شعراء میں سے ہے۔ یہ ایران کا ایک شاعر خاندان تھا۔ ان میں سے اسمٰعیل بن لیار محمد اور ابراہیم زیادہ مشہور ہیں۔ تینوں شعراء کے اشعار عام طور پر گائے جاتے تھے۔ یہ سب کے سب ایرانی عصبیت کا شکار تھے۔ ان میں اہل عجم کے لئے بڑا تعصب تھا۔ اور وہ عربوں پر کڑی تنقیدیں کیا کرتے تھے۔

ان کے علاوہ ابوالعباس اعمیٰ جن کی اصل آذربائیجان سے تھی اور موسیٰ شہوات — ان کی اصل بھی آذربائیجان ہی سے تھی۔ اور دوسرے بہت سے شعراء بھی مشہور ہوئے ہیں۔

یہ اور ان جیسے دیگر شعراء نے ایرانی ماحول میں پرورش پائی۔ اور فارسی لٹریچر میں انہوں نے مہارت حاصل کی۔ پھر انہوں نے اپنے لٹریچر کو عربی قالب میں ڈھال دیا۔ اور بڑی عمدہ پیروی کا ثبوت دیا۔ ان کے الفاظ عربی ہیں، ترکیبیں عربی ہیں اور ان بھی عربی ہیں لیکن یہ باتیں اس سے مانع نہیں ہو سکتی تھیں کہ بعض ایرانی مضامین، ایرانی خیالات اور ایرانی روح ان کے دلوں میں سرایت کئے ہوئے ہوتی تھی۔ جوان کے اشعار میں الفاظ کا جامہ پہن لیتی تھی۔ اگر ساسانی لٹریچر اور ساسانی اشعار کے کچھ نمونے ہمیں مل جاتے تو وضاحت کیلئے دونوں لٹریچروں میں موازنہ کرنا ممکن ہو سکتا تھا۔ اور تفصیل کے ساتھ یہ بتایا جا سکتا تھا کہ اس خوشہ چینی کی کیفیت کیا ہوتی تھی۔ لیکن ایرانی لٹریچر نہ مل سکنے کے باوجود ان لوگوں کے اشعار میں جن کے نام ہم نے اوپر لئے ہیں۔ ہمیں نئے مضامین، نئے رجحانات ضرور ملتے ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ زیاد کے قریب کسی فاختہ نے نغمہ سنجی شروع کی تو زیاد نے کہا ؎

تغنّی انتِ فی ذممی وعهدی　　　وذمّةِ والدی اِن لم تطاری
وبیتکِ اصلحیه ولا تخافی　　　علی صفرٍ مزغّبةٍ صغارِ
فانّکِ کلما غنّیتِ صوتاً　　　ذکرتُ احبّتی وذکرتُ داری
فامّا یقتلوکِ طلبتُ ثأراً　　　له نبأٌ لانّکِ فی جواری

(تو میری حفاظت اور ذمہ داری اور میرے باپ کی حفاظت میں گاتی رہ اور مطمئن رہ کہ تجھے اڑایا نہیں جائے گا۔ تو اپنے گھونسلے کو سرسبز چھوٹی چھوٹی شاخوں پر جس میں نئی ہری ہری کونپلیں نکل رہی ہوں درست کرلے اور مطلق خوف نہ کھا کیونکہ تو جب بھی نغمہ سرائی کرتی ہے مجھے میرے دوست اور میرا گھر یاد آجاتا ہے۔ اگر کسی نے تجھے قتل کر دیا تو میں اس سے تیرے خون کا بدلہ لوں گا۔ ایسا بدلہ لوں گا کہ اس کی خبر چار دانگ عالم میں پھیل جائے گی۔ کیونکہ تو میری پناہ میں ہے۔)

لوگوں کا بیان ہے کہ حبیب بن مہلب نے جب یہ اشعار سنے تو اس نے فاختہ کو قتل کر دیا۔ زیاد نے مہلب کے سامنے اس تعدی کی شکایت کی۔ چنانچہ مہلب نے اس کی زیر حفاظت فاختہ کا خون بہا ادا کرنے کا حکم دیا۔ آپ میرے ساتھ اس احساس میں ضرور

---

[1] ابن قتیبہ کی الشعر والشعراء ملاحظہ کیجئے۔ [2] یسار کا نام نسائی اس لئے پڑ گیا تھا کہ یہ شادی کو کھانا پکایا کرتا تھا اور اسے فروخت کیا کرتا تھا۔ جسے ضرورت ہوتی تھی۔ وہ اس سے خرید لیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی نسبت عورتوں کی طرف کی جانے لگی تھی۔

شریک ہوں گے کہ یہ شعر[1] اس طریقہ پر عربی شاعری میں بالکل نیا ہے۔ جو اس سے پہلے مجھے کسی شاعر کے ہاں نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ جانور کی حمایت کے سلسلہ میں اس تخیل پر وثنیت کے اثرات ہوں۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ابن یسار اور اس کے بھائی نیشنلزم کا شکار تھے۔ اسمٰعیل بن یسار کے بارے میں ابوالفرج کا بیان ہے کہ اس میں ایرانیوں کے لئے زبردست عصبیت تھی اور وہ ایرانیوں پر فخر کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی بھر پٹتا پھرتا اور راندہ و درماندہ رہا۔ قدرتی طور پر اس جیسے خاندان کے افراد میں ایرانی لٹریچر سے بھی تعصب ہونا چاہیئے تھا کیونکہ ایرانی رجحانات کا یہ تقاضا تھا۔ چنانچہ اسمٰعیل عربوں پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

رُبَّ خَالٍ مُتَوَّجٍ لِي وَعَمٍّ　　　مَاجِدٍ مُجْتَدًى كَرِيمِ النِّصَابِ
إِنَّمَا سُمِّيَ الْفَوَارِسُ بِالْفُرْسِ　　　مُضَاهَاةَ رِفْعَةِ الْأَنْسَابِ
فَاتْرُكِي الْفَخْرَ يَا أُمَامَ عَلَيْنَا　　　وَاتْرُكِي الْجَوْرَ وَانْطِقِي بِالصَّوَابِ
وَاسْأَلِي إِنْ جَهِلْتِ عَنَّا وَعَنْكُمْ　　　كَيْفَ كُنَّا فِي سَالِفِ الْأَحْقَابِ
إِذْ نُرَبِّي بَنَاتِنَا وَتَدُسُّو　　　نَ سِفَاهًا بَنَاتِكُمْ فِي التُّرَابِ

(میرے کتنے تاجپوش ماموں اور بلند مرتبہ، نفع رساں اور شریف النسب چچا گذر چکے ہیں۔ ایرانیوں ہی کی وجہ سے نسب کی بلندی کے ساتھ ساتھ شہسواروں کو شہسوار کہا جاتا ہے۔ اے امامہ! تو ہم پر فخر کرنا چھوڑ دے اور اس زیادتی کو ترک کر دے۔ حق بات بول۔ اگر تجھے معلوم نہیں ہے تو جا اور اپنے متعلق کسی سے پوچھ لے کہ گذشتہ زمانوں میں ہم کیسے رہے ہیں۔ جبکہ ہم اپنی لڑکیوں کی پرورش کیا کرتے تھے اور تم بیوقوفی اور حماقت سے اپنی لڑکیوں کو مٹی میں دبا دیا کرتے تھے!)

اسی اسمٰعیل کا ایک لمبا قصیدہ ہے۔ جس کی پاکیزگیٔ خیال قابل دید ہے۔ اس میں ہمیں ایران کی افسانوی روح اور منطقی تسلسل کی خوبی نظر آسکتی ہے۔ اس کا مطلع ہے۔

كُلْثُمُ أَنْتِ الْهَمُّ يَا كُلْثُمُ　　　وَأَنْتِ دَائِي الَّذِي أَكْتُمُ
أُكَاتِمُ النَّاسَ هَوًى شَفَّنِي　　　وَبَعْضُ كِتْمَانِ الْهَوَى أَحْزَمُ
قَدْ لُمْتِنِي ظُلْمًا بِلَا ظِنَّةٍ　　　وَأَنْتِ فِيمَا بَيْنَنَا أَلْوَمُ

(کلثوم! اے کلثوم! تو ہی میرا فکر ہے۔ اور تم ہی میری بیماری ہو جسے میں چھپاتا رہتا ہوں۔ میں لوگوں سے اس محبت کو چھپاتا ہوں جس نے مجھے سکھا کر کانٹا بنا دیا ہے۔ اور بعض مرتبہ محبت کو چھپانا ہی حیا کا تقاضا ہوتا ہے۔ تم نے بلا تہمت کے ظلماً مجھے ملامت کی ہے۔ حالانکہ ہمارے آپس میں تو ملامت کی زیادہ مستحق تم ہو!)

---

[1] اس شعر سے میرا مطلب جانور کی اس لئے حمایت نہیں کہ وہ اس کی حفاظت میں تھا کیونکہ بظاہر یہ چیز تو عربوں کے ہاں جاہلیت میں بھی مل جاتی ہے بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اس مضمون کو اتنی اہمیت دینا کہ گورنر کے سامنے خون بہا حاصل کرنے کے لئے دعویٰ دائر کیا جائے۔ یہ چیز عربوں میں نہیں تھی۔

اسی قصیدے میں وہ کہتا ہے۔

لَا تَتْرُكِيْنِيْ هٰكَذَا مَيِّتًا ... لَا أُمْنَحُ الْوُدَّ وَلَا أُصْرَمُ
أَوْفِيْ بِمَا قُلْتِ وَلَا تَنْدَمِيْ ... إِنَّ الْوَفِيَّ الْقَوْلِ لَا يَنْدَمُ

(مجھے یوں مردہ نہ چھوڑ دے کہ نہ مجھے محبت عطا کی جاتی ہے۔ اور نہ مجھ سے قطع تعلق کیا جاتا ہے۔ جو کچھ تو نے کہا ہے اسے پورا کر اور نادم نہ ہو۔ اپنی بات کو پورا کرنے والا نادم نہیں ہوا کرتا۔)

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ

آيَاتُ أَمْشِيْ حَذِرًا لِلْعِدٰى ... وَاللَّيْلُ دَاجٍ حَالِكٌ مُظْلِمُ
وَدُوْنَ مَا حَاوَلْتُ إِذْ زُرْتُكُمْ ... أَخُوْكِ وَالْخَالُ مَعًا وَالْحَمُ
وَلَيْسَ إِلَّا اللهُ لِيْ صَاحِبٌ ... إِلَيْكُمْ وَالصَّارِمُ اللَّهْذَمُ
حَتّٰى دَخَلْتُ الْبَيْتَ فَاسْتَذْرَفَتْ ... مِنْ شَفَقٍ عَيْنَاكِ لِيْ تَسْجُمُ
ثُمَّ انْجَلَى الْحُزْنُ وَرَوْعَاتُهُ ... وَغُيِّبَ الْكَاشِحُ وَالْمُبْرِمُ

(رات جبکہ تیرہ و تاریک تھی۔ میں دشمنوں کے خوف سے چپکے چپکے چل رہا تھا۔ اور تم سے ملنے کا جب میں نے ارادہ کیا تو اس کی تکمیل سے روکنے والے تیرا بھائی، ماموں اور دیور راستے میں حائل تھے۔ ارادہ کی تکمیل کی راہ میں میرا ساتھی سوائے خدا کے بزرگ اور شمشیر بران کے اور کوئی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ میں گھر میں داخل ہو گیا تو تیری آنکھیں خوف سے پریشان ہو گئیں جو میرے لئے ہر دم روتی رہتی تھیں۔ کچھ دیر بعد غم اور اس کے اثرات کافور ہو گئے اور بداندیش منصوبہ ساز ذہن سے بالکل اوجھل ہو گئے۔)

یہ قصیدہ کافی طویل ہے۔ اور اسی انداز سے چلا گیا ہے[1]۔ اس کے بھائی ابراہیم کے بھی اسی انداز کے اشعار ہیں جن میں وہ ایرانیوں پر فخر کرتا اور عربوں کے خلاف ان کے اعزاز گناتا ہے۔

اس میں آنا اضافہ اور کیجئے کہ عرب کے بہت سے شعراء اور ادباء ایران یا عراق میں آ کر بستے تھے۔ اہل ایران کے ساتھ خلط ملط ہو کر ان کی مدنیت اور تہذیب سے متاثر ہوتے تھے جس کے نمایاں اثرات ان کی شاعری میں نظر آتے تھے۔ طرماح، کمیت، ابوالنجم، راجز، جریر، فرزدق عراق میں آتے جاتے رہتے تھے۔ ایسے ہی نہار بن توسعہ، ثابت قطنہ، ابن مفرغ حمیری اور مغیرہ بن حبناء وغیرہ خراسان میں آتے رہتے تھے۔ ان شعراء کے نفس اور تخیل پر ایرانی تہذیب جو اثرات چھوڑتی ہو گی، وہ ظاہری ہیں۔

(دوم) فارسی لٹریچر کی اثراندازی کی وجوہ میں سے ایک لغوی جہت بھی ہے۔ مہیں معلوم ہے کہ عربی زبان زمانہ جاہلیت میں بدوی زندگی کے احوال و ظروف اور اس کے متعلقات کے بارے میں کافی سرمایہ دار تھی۔ جب انھوں نے ایران اور روم کے اکثر شہروں کو

---

[1] یہ قصیدہ اغانی صفحہ ۱۲۱–۱۲۲ ج ۴ میں آپ کو مل جائے گا۔

فتح کرلیا۔ اور زینت و آرائش اور تنعم و تعیش کی وہ وہ چیزیں دیکھیں جو اس سے پہلے انھوں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اور وہاں کے فنونِ جمیلہ اور دقیق صنعتیں سامنے آئیں۔ جن سے وہ اب تک واقف نہیں رہے تھے۔ علاوہ ازیں حکومت کا نظم و ضبط اور دفاتر کی ترتیب و تدوین نظر سے گذری جو اب تک ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ تو وہ اس کے لئے مجبور ہوئے کہ اقوامِ مفتوحہ سے ان چیزوں سے متعلق الفاظ لے کر انھیں اپنی زبان میں داخل کریں۔ ایرانی زبان وہ قریب ترین سرچشمہ ہو سکتی تھی جس سے وہ اپنی ضروریات میں مدد لے سکتے تھے چنانچہ كُوْزٌ۔ جَرَّةٌ۔ إِبْرِيْقٌ۔ طَشْتٌ۔ خِوَانٌ۔ طَبَقٌ۔ قَصْعَةٌ۔ خَزٌّ۔ دِيْبَاجٌ۔ سُنْدُسٌ۔ يَاقُوْتٌ۔ فَيْرُوْزٌ۔ بِلَّوْرٌ۔ كَعْكٌ۔ فَالُوْذَجٌ۔ لَوْزِيْنَجٌ۔ فُلْفُلٌ۔ زَنْجَبِيْلٌ۔ قِرْفَةٌ۔ نَرْجِسٌ۔ نَسْرِيْنٌ۔ سَوْسَنٌ۔ عَنْبَرٌ۔ كَافُوْرٌ۔ صَنْدَلٌ۔ قَرَنْفُلٌ۔ بُسْتَانٌ۔ أُرْجُوَانٌ۔ قِرْمِزٌ۔ سَرَاوِيْلُ۔ إِسْتَبْرَقٌ۔ تَنُّوْرٌ۔ جَوْزٌ۔ لَوْزٌ۔ دُوْلَابٌ۔ مِيْزَانٌ۔ زِنْبَقٌ۔ بَاشَقٌ۔ جَامُوْسٌ۔ كَيْلَسَانٌ۔ مَغْنَطِيْسٌ۔ مَارِسْتَانٌ۔ صَكٌّ۔ صَنْجَةُ الْمِيْزَانِ۔ صَوْلَجَانٌ۔ كُوْسَجٌ۔ نَوَافِجُ الْمِسْكِ۔ اَلْفَرْسَخُ۔ اَلْبَنْدُ۔ اَلزُّمُرُّدُ۔ اَلْآجُرُّ۔ اَلْجَوْهَرُ۔ اَلسُّكَّرُ۔ اَلطُّنْبُوْرُ[1]۔ ایسے الفاظ ہیں جو عربوں نے ایرانیوں سے لئے۔ ان اسماء کی طرف سطحی نظر سے دیکھنے سے یہ بات نظر آجاتی ہے کہ عربوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں ایرانیوں سے الفاظ لینے پڑے ہیں۔ اور یہ بات قطعاً سمجھ میں نہیں آتی کہ عربوں نے صرف یہ الفاظ ہی لئے ہوں۔ ان کے ساتھ فقروں کی نئی نئی ترکیبیں، نئے نئے مضامین اور نئے نئے خیالات نہ لئے ہوں۔ اگرچہ یہ متعین کرنا بڑا ہی مشکل ہے کہ اس ضمن میں انھوں نے کتنا کچھ لیا کیونکہ مضامین اور خیالات وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کا سرقہ ہوتا رہا ہے۔ اور بہت کم ان کو ضبطِ تحریر میں لایا جا سکا ہے کیونکہ کسی قوم نے اپنے خیالات اور مضامین کی کوئی فہرست نہیں بنائی۔ جیسا کہ ہر قوم نے اپنے الفاظ و حروف کی فہرستیں تیار کی ہیں۔

(سوم) حکمتیں۔ اسلامی اخلاق و آداب پر بھی ایرانیوں نے اپنی ضرب الامثال اور حِکَم کی راہ سے کافی اثرات مرتب کئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی اخلاق پر تین چیزوں کا زیادہ تر اثر پڑا ہے (اول) دینی تعلیمات جیسا کہ قرآن کریم میں ہے يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! خدا کے قانون سے ہم آہنگ رہو۔ اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو) اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (عدل و انصاف کرو کہ یہی طریقہ قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ بننے سے قریب تر ہے) لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے) يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُوْدِ (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اپنے عہدوں کو پورا کیا کرو) قرآن کریم سے اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ نیز وہ ہدایات جو احادیث میں آئی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے۔ "اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند کرو جو تم خود اپنے لئے پسند کرتے ہو" نیز ادیانِ سابقہ کی تعلیمات جو تورات و انجیل اور امثالِ سلیمان وغیرہ سے ہمارے ہاں نقل ہوتی آئی ہیں۔ (دوم) ——— یونانی فلسفہ جو عباسی دورِ حکومت میں عربی زبان میں منتقل ہوا۔ اس کی مثالیں ابن مسکویہ کی اس کتاب میں تم پڑھ سکتے ہو۔ جس میں ابن مسکویہ نے ارسطو کے اس نظریہ کی تشریح

---

[1] ملاحظہ ہو ثعالبی کی "فقہ اللغۃ" اور سیوطی کی "المزہر" اور کھانوں کی اقسام اور آلاتِ غذا کے لئے کتاب "المخصص"

کی ہے کہ ہر عمدہ خلق (فضیلت) دو بُرے اخلاق (رذیلت) کا درمیانی واسطہ ہوتا ہے یا افلاطون کا یہ نظریہ کہ فضائل کی چار بنیادیں ہیں۔ حکمت۔ عفت۔ شجاعت اور عدل وغیرہ ـــ (سوم) ـــ اور یہی چیز ہمارے نزدیک اس مقام پر اہم ہے ـــ حکمتوں اور چھوٹے چھوٹے فقروں کے وہ ٹکڑے جو ضرب الامثال کی طرح ڈھل گئے ہیں۔ اور یا وہ حکایتیں جن میں بادشاہوں۔ وزیروں اور واعظوں اور اس زمانہ کے حکیموں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں عربی لٹریچر میں بھری پڑی ہیں۔ اور دراصل اسلامی اخلاق ان چیزوں سے بہ نسبت یونانی فلسفہ کے کہیں زیادہ متاثر ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے فقرے عقل عربی سے قریب تر تھے۔ میں اس سے پہلے وضاحت کے ساتھ لکھ چکا ہوں کہ عقل عربی عموماً کسی منظم اور مفصل تحقیق و تدقیق کی طرف میلان نہیں رکھتی۔ ان کے نزدیک یہ کہیں بہتر تسلیم کیا جاتا ہے کہ سالہائے دراز کے تجربات کو چند چھوٹے چھوٹے فقروں میں مرکوز کر دیا جائے۔ اس طرح وہ کچھ فقرے مرتب کر لیتے ہیں۔ اور ہر فقرہ ایک خاص مضمون سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک اگر شجاعت سے متعلق ہے تو دوسرا اگر سخاوت و کرم سے تعلق رکھتا ہے۔ اور تیسرا فقرہ ذلت سے تعلق رکھتا ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ شجاعت کو بیان کیا جائے تو اس کی تفصیلات بیان کی جائیں۔ اور ہر جہت سے اس پر نظر ڈالی جائے۔ اور بتایا جائے کہ اس کو ابھارنے والے کیا اسباب ہو سکتے ہیں وغیرہ ذلک۔ تو یہ چیز عربی ذوق اور عربی عقل سے بعید ہے۔ یہ چیز تو کچھ یونانی عقل ہی کو راس آتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب عربوں کو ایران میں اس قسم کی حکمتیں ملیں تو وہ انھیں بہت پسند آئیں۔ انھوں نے ان کو اپنے ہاں منتقل کر لیا۔ اور جو ذخیرہ حِکَم ان کے ہاں زمانہ جاہلیت سے چلا آ رہا تھا۔ انھوں نے اس میں ان کا اور اضافہ کر لیا کہ ایرانیوں کے ہاں اس قسم کا کافی ذخیرہ تھا۔ جس میں سے کچھ تو خود ان کی تخیل کا پیدا کردہ تھا اور کچھ ہندوستان سے ان کے ہاں منتقل ہو کر آیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لئے واضح ترین نمونہ ابن المقفع کی کتاب "الادب الصغیر" اور "الادب الکبیر" سے مل سکتا ہے۔ یہ کچھ تو عباسی دورِ حکومت میں ہوا۔ مگر اس سے پہلے اموی دورِ حکومت میں بھی اس قسم کی حکمتیں عربوں میں منتقل ہوتی تھیں۔ اور علماء ان کو استعمال کرتے تھے بلکہ لوگ ان کے مطابق اپنا کیریکٹر بناتے تھے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ کو حسن بصری ایرانی کے کلام میں مل جائیں گی۔ ایسے ہی ابن قتیبہ کی "عیون الاخبار" اور طرطوسی کی "سراج الملوک" "تاج" اور العقد الفرید میں بھی مل جائیں گی۔

یہاں یہ چیز نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس قسم کی حِکَم میں عربی ذوق ایرانی ذوق سے مکمل مشابہت رکھتا ہے۔ چنانچہ جو حکمتیں زمانۂ جاہلیت میں اکثم ابن صیفی کی طرف اور زمانہ اسلام میں حضرت علیؓ کی طرف ایسے ہی وہ حکمتیں جو سردارانِ عرب مثل احنف بن قیس اور دغفل بن زنباع کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ اپنی ترکیب طرزِ ادا اور فکر و نظر کی گہرائی میں ان حِکَم سے زبردست مشابہت رکھتی ہیں۔ جو لٹریری کتابوں میں بزرجمہر۔ بہدیر اور موبذ موبذان وغیرہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ابن عبدربہ نے اپنی کتاب العقد الفرید میں ایک فصل میں اکثم بن صیفی اور بزرجمہر کی امثال کے عنوان کے ماتحت بہت سی حکمتیں بیان کی ہیں اور یہ نہیں بتایا کہ ان میں سے کون سی اکثم بن صیفی کی ہیں۔ اور کونسی بزرجمہر کی۔ چنانچہ اکثر امثال میں یہ پتہ چلانا نہایت ہی دشوار ہے کہ ان میں سے کون سی اکثم کی ہو سکتی ہیں۔ اور کونسی بزرجمہر کی[1]۔ اب میں آپ کے سامنے ایرانی حکمتوں کا ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتا ہوں۔

---

[1] العقد الفرید صفحہ ۳۳۱۔ ج ۱۔

(۱) بزرجمہر نے کہا "جب تجھ پر دو باتیں مشتبہ ہو جائیں اور تو یہ نہ معلوم کر سکے کہ ان میں سے کون سی درست ہے تو دیکھ ان میں سے کونسی بات تیری خواہش نفس سے قریب تر ہے۔ بس اسی کو چھوڑ دے"۔

(۲) پرویز نے اپنے بیٹے شیرویہ کو لکھا تھا۔ "تھوڑی خیانت پر بھی ہی سزا دو جیسی بڑی خیانت پر دیتے ہو۔ کیونکہ تمہارے خلاف بڑی خیانت کی جرأت اسی وقت نہیں ہو سکتی جبکہ لوگوں کو تھوڑی خیانت کی طمع بھی پیدا نہ ہو۔ اگر محصل خراج میں سے ایک درہم بھی کم دیتا ہے تو اسے موت کے گھاٹ اتار دو۔ اس جرم پر اتنی سخت سزا دو کہ جو کسی دوسرے جرم پر دی ہی نہ جا سکے۔ اگر کوئی محصل پوری پوری وصولیات ادا کر دیتا ہے تو اس سے اتنے انعام و اکرام سے پیش آؤ جتنے کسی دوسری بات پر نہ آ سکو۔ اس کا سب سے بڑا انعام و اکرام اور بہترین صلہ یہی ہے کہ اس کی جان کی حفاظت کرو اور اسے اس کی پوری پوری تنخواہ ادا کر دو۔ مگر اسے یہ محسوس نہ کرنے دو کہ تم یہ کچھ اس لئے کر رہے ہو کہ تم نے اس کی پاکدامنی کو بہت سراہا ہے"۔

(۳) کسریٰ نے یوشت مغنی سے کہا کہ جبکہ اس نے فلہوذ (اغانی کی روایت میں فہلبذ ہے) کو قتل کر دیا تھا جو اس کا شاگرد ہونے کے باوجود اس سے فنی مہارت میں فوقیت لے گیا تھا کہ "اس سے اکتا کر میں تجھ سے راحت پا لیتا تھا۔ اور تجھ سے اکتا کر میں اس سے راحت پا لیا کرتا تھا لیکن تیرے سینہ کی تنگی اور حسد نے میری آدھی راحت کو ختم کر دیا۔" پھر کسریٰ نے حکم دیا کہ یوشت کو ہاتھی کے پیروں میں ڈال دیا جائے تاکہ وہ اسے روند ڈالیں۔ اس پر یوشت نے عرض کیا کہ "شہنشاہ! میں نے آپ کی آدھی خوشی اور راحت کو ختم اور برباد کر دیا تھا۔ مگر آپ باقی آدھی خوشی اور راحت کو ختم اور برباد کئے ڈالتے ہیں۔ اپنی خوشی اور راحت کے خلاف آپ کا جرم بھی میرے جرم کے برابر ہی ہے"۔ کسریٰ نے حکم دیا کہ اسے چھوڑ دو۔ اس کی عمر درازنہ ہوتی تو ایسی بات اسے کبھی نہ سوجھتی۔

(۴) کسریٰ نے کہا سخی آدمی کے حملے سے اس وقت بچو جب وہ بھوکا ہو۔ اور بخیل کے حملے سے اس وقت بچو جب وہ پیٹ بھرا ہوا ہو۔

(۵) اردشیر بن بابک نے کہا۔ "کان تھک جاتے ہیں۔ اور دل اکتا جاتے ہیں۔ حکمت کی دو باتیں ایک ساتھ بیان نہ کرو۔

(۶) سیر العجم میں ہے کہ "ایک آدمی نے دوسرے آدمی کی اسکندر کے سامنے چغلی کھائی۔ اسکندر نے کہا کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ جو کچھ تم اس کے خلاف کہو ہم اسے بھی مان لیں۔ اور جو کچھ وہ تمہارے خلاف کہے اسے بھی مان لیں۔ اس پر اس آدمی نے کہا، نہیں سرکار! اسکندر نے کہا کہ پھر برائی کو روکے رکھو۔ تاکہ برائی تم سے بھی رکی رہے"۔

(باقی ۴ صفحہ ۵۸)

نوادرات
از علامہ اسلم جیراجپوری
علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ　بڑا سائز۔ صفحات ۴۰۰۔ قیمت چار روپے

مجلسِ اقبال

(مسلسل) — در شرحِ اسرارِ اسمائے علی مرتضیٰؓ

سابقہ قسط میں حضرت علامہ نے بتایا تھا کہ ایک مردِ مومن کا مقام کیا ہوتا ہے۔ اور اس کی خودی کے استحکام سے ملت کو کس طرح سربلندیاں اور سرفرازیاں عطا ہو جاتی ہیں۔ زیرِ نظر قسط میں انھوں نے حضرت علیؓ کے اسماء کی تلمیح کے انداز میں بتایا ہے کہ مردِ مومن کس طرح نامساعد حالات سے نبرد آزما ہو کر انھیں اپنے پروگرام کے مطابق بنا لیتا ہے۔ اس ضمن میں اصل مضمون تک آنے سے پہلے، چند الفاظ بطور تمہید بہت ضروری ہیں۔۔

نبی اکرمؐ نے اپنے متبعین (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) کی رفاقت سے اس نظام کو عملاً متشکل فرمایا جو حضورؐ کو قرآن میں عطا ہوا تھا۔ اسی نظام کی تشکیل میں اس جماعت مومنین کے السابقون الاولون نے جس استقامت، پامردی، ایثار، فقر، فنا اور سرفروشی کا ثبوت دیا۔ قرآن کریم اس کی مدح و ستائش میں زمزمہ بار ہے۔ یہ انہی حضراتؓ کے جہادِ مسلسل اور سعیِ پیہم کا صدقہ ہے کہ اسلام اس حسن کارانہ انداز سے آگے بڑھا۔ ان کا یہ احسان نہ صرف بعد میں آنے والے مسلمانوں پر ہی ہے بلکہ نوعِ انسانی پر ہے۔ جس کی سپاس گذاری سے ہم کبھی کما حقہٗ عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔

السابقون الاولون کی اس جماعت کے بعض افراد کو دوسرے افراد پر ترجیح دینے کا خیال، شیعہ حضرات کے معتقدات کی بنا پر پیدا ہوا۔ چونکہ اس گروہ کے اپنے مخصوص عقائد ہیں۔ اور جیسا کہ معلوم ہے۔ ہمیں گروہ بندی اور فرقہ داری سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے ہم ان عقائد پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ اس گروہ سے باہر حضرت علیؓ کی فوقیت اور برتری کا خیال، ہمارے ہاں کے تصوف کا پیدا کردہ ہے جس میں (ایک آدھ سلسلہ کو چھوڑ کر باقی) سب سلسلوں کا منتہیٰ حضرت علیؓ ہی قرار پاتے ہیں۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) علامہ اقبال کے تحت الشعور میں (تصوف کی مخالفت کے باوجود) تصوف کی رمق آخر تک باقی رہی تھی۔ اس لئے ان کے ہاں بھی حضرت علیؓ کی شان میں بعض مقامات پر غلو پایا جاتا ہے۔ جس زمانہ میں انھوں نے مثنوی اسرار و رموز لکھی تھی۔ اس دور میں یہ غلو اور بھی شدید تھا۔ چنانچہ ان کے اس قسم کے اشعار جو انھوں نے بعد میں اپنے مجموعوں میں شامل نہیں کئے) اسی دور کی یادگار تھے۔ (مثلاً)

تحفہ میرا مدینہ ہے، مدینہ میرا کعبہ ہے
میں بندہ اور کا ہوں امتِ شاہِ ولایت ہوں

جو سمجھوں اور کچھ خاکِ عرب میں سونے والے کو
مجھے معذور رکھ میں مست صہبائے محبت ہوں

مثنوی کے زیرِ نظر باب میں بھی بعض مقامات پر وہی قسم کا غلو نظر آتا ہے۔ ہم اس غلو کو قرآن کی تعلیم کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس سے متفق نہیں ہو سکتے۔ ہم احترام و عقیدت کو بھی اسی حد تک جائز قرار دے سکتے ہیں۔ جس حد تک قرآن اس کی اجازت دیتا ہے۔ اقوام سابقہ نے اپنے انبیائے کرام اور اپنے بزرگوں کی شان میں جو غلو کیا تھا۔ وہ بھی بربنائے محبت و عقیدت ہی تھا۔ دشمنی اور انتقام کی بنا پر نہیں تھا۔ قرآن نے ان کے اس غلو کی مخالفت کی ہے۔

اس تمہید کے بعد مثنوی کی طرف آیئے۔

مسلم اول شہِ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ

حضرت علیؓ سب سے پہلے مسلمان۔ بہادروں کے بادشاہ۔ اور عشق کی نگاہ میں ایمان کا سرمایہ ہیں۔

از ولائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

میں انہی کے خاندان کی محبت کی وجہ سے زندہ ہوں۔ نہ صرف زندہ ہوں بلکہ دنیا میں موتی کی طرح چمکتا بھی ہوں۔

نرگسم دارفتۂ نظارہ ام
در خیابانش چو بو آوارہ ام

میں نرگس کی آنکھ رکھتا ہوں۔ جو ہر وقت محوِ نظارہ رہنا چاہتی ہے۔ میں ان کے باغ میں خوشبو کی طرح آزاد پھر رہا ہوں۔

زمزم ار جوشد ز خاکِ من اندست
مے اگر ریزد ز تاکِ من از دست

اگر میری مٹی سے زمزم کا چشمہ پھوٹ کر بہہ رہا ہے تو یہ انہی کے تصدق سے ہے۔ اور اگر میرے انگوروں کے خوشے سے شراب ٹپکتی ہے تو یہ بھی انہی کی بدولت ہے۔

خاکم و از مہرِ او آئینہ ام
می تواں دیدن نوا در سینہ ام

میں بذاتِ خویش تو محض خاک ہوں۔ اگر میری یہ خاک آئینہ بن گئی ہے تو یہ ان کے خورشید جہاں تاب کے پرتو کا اثر ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ میرے سینہ میں جو نوائے دردانگیز دیکھتے ہو تو یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔

از رخِ او فال پیغمبر گرفت
ملتِ حق از شکوہش فر گرفت

حضرت علیؓ کے چہرہ مبارک سے نبی اکرمؐ فال لیا کرتے تھے۔ ان کی شجاعت اور جوانمردی سے دین حقہ، اور امت مسلمہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

قوتِ دین مبیں فرمودہ اش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

آپ (حضرت علیؓ) کے ارشادات، دین اسلام کی قوت کا موجب ہیں۔ اور تمام کائنات میں جو نظم وضبط ہے۔ اور آئین و قانون کی پابندی پائی جاتی ہے تو آپ کے خاندان کی بدولت ہے۔

مرسلِ حق کرد نامش بوتراب
حق یداللہ خواند در امِ الکتاب

نبی اکرمؐ نے حضرت علیؓ کو بوتراب کا لقب عطا فرمایا جس کے معنی ہیں "مٹی کا باپ" کہتے ہیں کہ ایک دن حضورؐ نے دیکھا کہ حضرت علیؓ مسجد کے ننگے فرش پر سو رہے ہیں جس کی وجہ سے آپ کا جسم گرد آلود ہو رہا ہے۔ آپ نے اس بناء پر از راہ محبت حضرت علیؓ کو بوتراب کہہ کر پکارا۔ اور اس سے آپ کا یہ لقب مشہور ہو گیا۔

مصرعہ دوم میں علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن میں حضرت علیؓ کو یداللہ (اللہ کا ہاتھ) قرار دیا ہے (ہمیں قرآن کریم میں یہ بات کہیں نہیں ملی)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے "ابوتراب" کے لقب سے فلسفیانہ نکات پیدا کئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

عصر کہ دانائے رموزِ زندگیست
سرِ اسمائے علیؓ داند کہ چیست

جو شخص زندگی کے اسرار و رموز سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت علیؓ کے ان اسماء (ابوتراب اور یداللہ) کے اندر کیا راز پنہاں ہے وہ راز یہ ہے کہ

خاکِ تاریکے کہ نامِ او تن است — عقل از بیدادِ او در شیون است
فکرِ گردوں رس زمیں پیما از و — چشم کور و گوش ناشنوا از و
از ہوس تیغ دو رو دارد بدست — رہرواں را دل بریں رہزن شکست

یہ مٹی۔ یہ مادی ماحول۔ یہ طبعی جسم۔ یہ خاکِ تاریک جس کے ہاتھوں ہماری عقل ہمیشہ نالاں و فریادی رہتی ہے۔ اس لئے انسانی فکر جو آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر سکتا ہے۔ وہ جب مادی عواطف اور میلانات میں گھر جاتا ہے تو پھر اسی دلدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے وہ مادی جاذبیتوں میں الجھ کر اپنی بلند پروازی کو کھو دیتا ہے۔ اور انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ نہ اس کی آنکھیں کچھ دیکھ سکتی ہیں۔ اور نہ اس کے کان کچھ سن سکتے ہیں۔ مادی ہوس ایک دو دھاری تلوار ہے۔ جس کے ہاتھوں کاروان زندگی ہمیشہ دل شکستہ رہتا ہے کہ معلوم

یہ غارت گر دین و دانش کس مقام پر رہزن بن کر سب کچھ لوٹ لے۔ لیکن

شیرِ حق ایں خاک را تسخیر کرد
ایں گِلِ تاریک را اکسیر کرد

اللہ کے اس شیر (حضرت علیؓ) نے اس خاک کو مسخر کر لیا۔ اور اس طرح اس مٹی کو اکسیر بنا دیا۔

مرتضیٰؓ کز تیغِ او حق روشن است
بوتراب از فتحِ اقلیمِ تن است

حضرت علی مرتضیٰؓ کہ جن کی شمشیر سے دنیا میں حق روشن ہوا۔ ابوتراب اس لئے کہلاتے کہ انہوں نے اپنے مادی جسم کو فتح کر لیا تھا انہوں نے مادی عواطف کو اپنے تابع تسخیر کر لیا تھا۔

مرد کشور گیر از کراری است
گوہرش را آبرو خودداری است

حضرت علیؓ کا ایک لقب کرار بھی ہے جس کے معنی ہیں بار بار حملہ کرنے والا۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ انسان قوت و شوکت کے ساتھ مسلسل حملے کر کے ملک فتح کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے گوہرِ انسانیت کی حقیقی آبرو اس سے ہے کہ وہ خوددار کس قدر ہے۔ اسے اپنے آپ پر کس حد تک کنٹرول حاصل ہے۔ یہی "بوترابی" ہے۔

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

جو شخص دنیا میں ابوتراب بن جائے۔ جو اپنے آپ کو مسخر کر لے۔ اس میں اس قسم کی مافوق الفطرت قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ مغرب کی طرف جاتے سورج کو مشرق کی طرف لوٹا سکتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے عصر کی نماز ادا کرنی تھی۔ اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ تو آپ نے سورج کو وہیں روک لیا۔ (یا پیچھے لوٹا دیا) اور جب تک آپ نماز سے فارغ نہیں ہوئے۔ وہ آگے نہیں بڑھا۔

قرآن کریم خود نبی اکرمؐ کے متعلق بار بار اعلان کرتا ہے کہ حضورؐ کو بھی کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا (حضورؐ کا معجزہ قرآن کریم اور آپ کی بلندیٔ سیرت تھی) جب قرآن کی رو سے خود رسول اللہؐ کے متعلق یہ صورت تھی تو حضورؐ کے متبعین کے لئے حسی معجزات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہر کہ زیں بر مرکبِ تن تنگ بست
چوں نگیں بر خاتمِ دولت نشست

جس نے اپنے تنِ خاکی کے گھوڑے پر کس کر زین ڈال دی۔ اور اس طرح اسے اپنے تابع تسخیر کر لیا۔ سمجھو کہ دولتِ کونین اس کے قبضہ میں آگئی

زیرِ پاش اینجا شکوہِ خیبر است
دستِ او آنجا قسیمِ کوثر است

اس دنیا سے خیبر شکن قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور آگے دنیا میں وہ ساقیِ حوضِ کوثر بن جاتا ہے۔

از خود آگاہی یداللّٰہی کند
از یداللّٰہی شہنشاہی کند

چونکہ وہ اپنے آپ سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ اور اس طرح خدا کا ہاتھ بننے سے، وہ دنیا میں شہنشاہی کرتا ہے۔

ذاتِ او دروازۂ شہرِ علوم
زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم

اس کی ذات شہرِ علوم کا دروازہ بن جاتی ہے۔ ساری دنیا اس کی تابع فرمان ہو جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا میں علم کا شہر ہوں اور اس شہر کا دروازہ حضرت علیؓ ہیں۔

حکمراں باید شدن بر خاکِ خویش
تا مئے روشن خوری از تاکِ خویش

انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے مادی جسم پر حکومت کرے۔ اور اس طرح اپنے انگور کے خوشوں سے چمکتی ہوئی شراب پیئے۔

خاک گشتن مذہبِ پروانگی است
خاک را اب شو کہ ایں مردانگی است

حضرت علامہ کہتے ہیں کہ انسان کا خاک ہو جانا تو ان لوگوں کا مذہب اور مسلک ہے جو اپنی ذات کو پروانوں کی طرح فنا کر دینے کے قائل ہیں۔ یہ مسلک درست نہیں۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ انسان خاک کا باپ (ابوتراب) ہو جائے۔ لیکن اس کے لئے ہمت اور جرأت کی ضرورت ہے

سنگ شو اے ہمچو گل نازک بدن
تا شوی بنیادِ دیوارِ چمن!

تو پھول کی طرح نازک بدن ہے۔ یہ کیا زندگی ہے؟ تجھے پتھر کی طرح محکم ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ تو اس دیوار کی بنیاد بن سکے۔ جو باغ کی حفاظت کے لئے تعمیر کی جاتی ہے۔ اس وقت تجھے اپنی حفاظت کے لئے بھی دوسروں کی مدد درکار ہے۔ اس وقت تو تمام پھولوں اور پودوں کی حفاظت کرے گا۔ خود استحکامی سے اس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

از گلِ خود آدمے تعمیر کن
آدمے را عالمے تعمیر کن

تو اپنی مٹی سے ایک نیا آدم تعمیر کر۔ اور پھر اس آدم کے رہنے کے لئے ایک نئے جہاں کی تشکیل کر۔

گر بنا سازی نہ دیوار و درے
خشت از خاکِ تو بندد دیگرے

اگر تونے اپنا گھر تعمیر نہ کیا تو تیری مٹی سے دوسرے لوگ اپنے گھروں کے لئے اینٹیں تیار کرنے لگ جائیں گے۔ تو ان کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ جائے گا۔ اور یہ انسان کی انتہائی تذلیل ہے کہ وہ دوسروں کا آلۂ کار بن جائے۔

اے ز جور چرخ ناہنجار تنگ　　　جام تو فریادی بیداد سنگ

نالہ و فریاد و ماتم تا کجا　　　سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا

تو ہر روز فلک ناہنجار کے شکوے کرتا رہتا ہے۔ تجھے نامساعدت حالات کا ہمیشہ گلہ رہتا ہے۔ لیکن ذرا سوچ تو سہی کہ اس قسم کی آہ و زاری اور نالہ و فریاد کی زندگی کب تک؟ یہ فغان و شیون کیوں؟ نامساعدت حالات کو بدل دینے کا طریق یہ ہے کہ

در عمل پوشیدہ مضمون حیات

لذت تخلیق، قانون حیات

زندگی کا راز عمل میں پوشیدہ ہے۔ اور زندگی کا قانون اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان کائنات کے تخلیقی پروگرام میں خدا کا رفیق بن جائے اور اس میں لذت لے۔ تولید (PROCREATION) حیوانی سطح کا میکانکی عمل ہے۔ یہ انسان اور حیوان دونوں میں مشترک ہے لیکن تخلیق (CREATION) خالص انسانی عمل ہے جس میں کوئی حیوان شریک نہیں ہو سکتا۔ تخلیق کے معنی ہیں کائنات کے مختلف قوائے اور عناصر سے نئی نئی تراکیب سے نئی چیزیں ظہور میں لانا۔ زندگی کی جوئے رواں اپنے تخلیقی اضافوں کے زور پر آگے بڑھتی ہے۔ جو قوم لذت تخلیق سے محروم ہو جاتی ہے۔ وہ زندہ نہیں رہتی نقش بدوش پھرتی رہتی ہے۔ لہٰذا نامساعدت حالات کا مقابلہ کرنے کی جگہ موافق حالات پیدا کرنے کا طریق یہ ہے کہ

خیز و خلاق جہان تازہ شو

شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو

اٹھ اور اپنے لئے ایک جہان نو کی تخلیق کر۔ نامساعدت حالات کی مشتعل آگ کو اپنے آغوش میں سمٹا کر، حضرت خلیل اکبر کی طرح اس آگ کو امن و سلامتی میں تبدیل کر دے اس لئے کہ

با جہان نامساعد ساختن

ہست در میدان سپر انداختن

ناموافق حالات کے ساتھ مفاہمت کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے کشمکش حالات سے منہ موڑ کر جہاد زندگی میں شکست قبول کر لی ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے بتایا ہے کہ وہ انسان جس کی خودی مستحکم ہو، نامساعد حالات کے وقت کیا کرتا ہے۔ اس حصہ کو ہم آئندہ قسط پر اٹھا رکھتے ہیں۔

اقبال اور قرآن ——— ۳۵۶ صفحات ——— قیمت دو روپے

احکام کی تبدیلی

(علامہ صبحی محمصانی۔ بیروت)

طلوعِ اسلام اس مسلک کا داعی ہے کہ جو فیصلے قرآنی اصولوں کی روشنی میں کسی ایک زمانہ میں ہوئے ہوں، جب حالات تبدیل ہو جائیں تو اسلامی نظام کو اس کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان فیصلوں میں مناسب تبدیلی کرے بشرطیکہ وہ قرآنی اصولوں سے نہ ٹکرائیں۔ طلوعِ اسلام اس باب میں گذشتہ آٹھ سال سے مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہے۔

علامہ صبحی محمصانی نے فلسفۃ التشریع فی الاسلام کے نام سے ایک مفید کتاب شائع کی ہے جس کا اردو ترجمہ مولوی محمد احمد رضوی صاحب نے کیا ہے۔ اس کتاب کے ایک باب میں انہوں نے اس اہم مسئلہ سے بھی بحث کی ہے کہ زمان و مکان کے تغیر احوال سے احکام شرعیہ میں تبدیلی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس میں انہوں نے (اپنی کتاب کے عام انداز کے مطابق) مخالف اور موافق ہر قسم کی آراء کو جمع کر دیا ہے۔ ہم اس باب کا اردو ترجمہ شائع کرتے ہیں اس سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ طلوعِ اسلام جس مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ کوئی نیا مسلک نہیں ہے بلکہ اسلاف میں بھی ایسے لوگ گذرے ہیں جو اس کے مؤید رہے ہیں۔ واضح رہے کہ ہم ان حضرات کی تائید کو بطور سند پیش نہیں کر رہے۔ ہماری سند تو صرف یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس تائید سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ طلوعِ اسلام نے یہ ایک نیا فتنہ پیدا کیا ہے جس سے امت اس سے قبل آشنا تک نہیں تھی۔ اور اسی جرم کی بنا پر اسے منکرِ حدیث قرار دیا گیا ہے۔ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ خیال نیا نہیں۔ یہ پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ حتیٰ کہ خود حضرت عمرؓ کا عمل اس کے مطابق رہا ہے لہٰذا اس خیال کی تائید کرنے والا منکرِ حدیث نہیں ہو جاتا۔

ڈاکٹر محمصانی کے متعلق اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ آپ نے فرانس اور لندن سے قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آپ پہلے بیروت میں مسلمانوں کی عدالتِ مرافعہ میں سرکاری وکیل تھے پھر وہاں کی امریکن یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر رہے اور آجکل بیروت کی عدالتِ مرافعہ کے صدر ہیں۔ ان کا شمار زمانہ حال کے نامور ماہرین قانون میں ہوتا ہے اور

اسلامی نقد ان کا خاص موضوع ہے۔ [طلوعِ اسلام]

خارجی ماخذ

شریعتِ اسلامیہ اپنے مبادی اور اصول اساسی کے لحاظ سے شریعتِ الٰہی ہے۔ اور چونکہ وہ شریعت الٰہیہ ہے، اس لئے زمان ومکان اور ضروریاتِ زندگی کے مطابق اس کے احکام کی تبدیلی کا مسئلہ نہایت غور طلب ہے۔

شریعتِ اسلامی کے ماخذ ومصادر کو علمائے اصول نے مشہور دلائل شرعیہ میں جمع کر دیا ہے[1]۔ جن سے ہم گزشتہ باب میں بحث کر چکے ہیں۔

یہاں دوسرے ماخذوں کی تحقیق و وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے جو ہمارے اصول کے اصطلاحی ماخذ میں داخل نہیں۔ اس سے وہ قانون سازی مراد ہے جو براہِ راست حکومتِ وقت کی طرف سے عمل میں آئی یا رسم ورواج اور شرعی حیلوں کے ذریعہ کی گئی۔ ہم نے ان ماخذوں کا نام خارجی ماخذ اس لئے رکھا ہے تاکہ ان میں اور ان اساسی ماخذوں میں فرق ہو جائے جو ادلۂ شرعیہ کے نام سے موسوم ہیں۔

ہم اس باب میں اس بات کی وضاحت کریں گے کہ تغیرِ احکام کے بارے میں مسلمان فقہا کی کیا روش رہی ہے۔ اور اسلامی قانون سازی میں کون سے خارجی اثرات کارفرما رہے ہیں۔ اس کے بعد علمائے اصول کے اس خاص اسلوب کی وضاحت کریں گے جو انھوں نے بیرونی اثرات اور ادلۂ شرعیہ میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اختیار کیا۔

شریعت کے مقاصد

بہت سے مسلمان فقہاء ایسے ہیں مثلاً عز بن عبد السلام شافعی، ابن القیم الجوزیہ حنبلی، اور ابو اسحٰق شاطبی مالکی وغیرہ[2] جنھوں نے شریعتِ اسلامی کے طریقوں اور اس کے مقاصد اور ان مصالح واسباب کے بارے میں جن پر وہ مقاصد مبنی ہیں، بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اور انھوں نے اس نقطۂ نگاہ سے احکامِ شرع کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک عبادات اور دوسری معاملاتِ دنیاوی۔

پہلی قسم میں مسائلِ عبادت سے بحث کی جاتی ہے جسے شرع کہتے ہیں۔ یہاں ہم اس سے بحث نہیں کریں گے۔ دوسری قسم کی غرض وغایت لوگوں کی دنیاوی فلاح وبہبود ہوتی ہے۔ بقول عز بن عبد السلام کے الفاظ میں "تمام احکامِ شرع کا مقصد بندوں کی دنیاوی بہتری اور آخرت کی بھلائی ہے۔ اللہ تعالےٰ سب کی عبادت سے بے نیاز ہے۔ نہ اسے فرمانبرداروں کی اطاعت کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ گنہگاروں کا گناہ کچھ نقصان پہنچا سکتا ہے"[3]۔

---

[1] یعنی قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ (طلوعِ اسلام)

[2] ان کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے۔ دیکھو قواعد الاحکام لابن عبد السلام (جلد ۱، صفحہ ۱ اور اس کے بعد) اور دیکھو موافقات الشاطبی (جلد ۲، صفحہ ۵ اور اس کے بعد)

[3] دیکھو قواعد الاحکام (جلد ۲، صفحہ ۷۰)

معاملات دنیاوی کے متعلق جو احکام ہیں۔ ان کے مقاصد معقول ہیں۔ کیونکہ وہ لوگوں کو نفع پہنچانے اور انھیں نقصانات سے بچانے کے اصول پر مبنی ہیں۔ بالفاظ دیگر دنیاوی معاملات اس اصول پر مبنی ہیں کہ نفع دینے والی چیزیں مباح ہیں۔ اور نقصان دینے والی ممنوع۔[1] اکثر فقہاء نے یہ اصول تسلیم کیا ہے سوائے چند علماء کے جیسے داؤد ظاہری وغیرہ کہ انھوں نے عبادات اور معاملات میں کوئی تفریق نہیں کی بلکہ عبادات و معاملات دونوں کو امر تعبدی قرار دیا ہے کہ جن کا معیار عقل نہیں ہو سکتی۔[2]

مقاصد شریعت کے بارے میں ابن القیم کا قول سب سے بہتر ہے کہ "شریعت کی بنیاد حکمتوں اور لوگوں کی دنیاوی و اخروی فلاح و بہبود پر ہے اور شریعت کل کی کل انصاف ہے۔ سراسر رحمت اور حکمت ہے۔ پس جس مسئلہ میں انصاف کی بجائے ظلم ہو، رحمت کی بجائے زحمت ہو۔ فائدہ کی بجائے نقصان ہو۔ اور عقل کی بجائے بے عقلی ہو وہ شریعت کا مسئلہ نہیں۔ اگرچہ اسے بذریعہ تاویل شریعت میں داخل کر لیا گیا ہو۔ پس شریعت خدا کے بندوں میں اس کا انصاف ہے اور اس کی مخلوق میں اس کی رحمت ہے۔ ۔۔ اسی سے زندگی ہے۔ غذا ہے۔ دوا ہے۔ نور ہے۔ شفا ہے اور حفاظت ہے۔ زندگی کی ہر بھلائی شریعت سے وابستہ ہے۔ اور زندگی کے ہر نقصان کا سبب ترک شریعت ہے۔۔۔۔ چنانچہ یہ شریعت خدا نے اپنے رسول پر نازل فرمائی ہے وہ عالم کا ستون ہے۔ اور دنیا و آخرت کے تمام حلقہ ہائے فلاح و بہبود کا محور ہے۔"[3]

تبدیلی احکام کا اصول

ابن خلدون نے کہا ہے کہ دنیا کے حالات اور اقوام عالم کی عادات ہمیشہ ایک حالت پر باقی نہیں رہتیں۔ دنیا تغیرات زمانہ اور انتقالات احوال کا نام ہے۔ اور جس طرح یہ تبدیلیاں افراد، ساعات اور شہروں میں ہوتی ہیں، اسی طرح دنیا کے تمام گوشوں، تمام زمانوں اور تمام حکومتوں میں واقع ہوتی ہیں۔ خدا کا یہی طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں ہمیشہ سے جاری ہے۔[4]

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کی اس انقلاب پذیری کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ انسانی کا معیار بدلتا ہے۔ لوگوں کی فلاح و بہبود کے معیار بھی بدل جاتے ہیں۔ اور چونکہ بندوں کی بہتری ہی ہر قانون کی بنیاد ہے لہٰذا عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ زمانہ اور معاشرہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ احکام شرع میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ نیز وہ اپنے گرد و پیش کے اجتماعی حالات سے بھی متاثر ہوتے رہیں۔[5]

ابن القیم جوزیہ نے اس اصول کے اثبات میں کیا خوب کہا ہے کہ احکام کی تبدیلی اور اختلاف زمان و مکان۔ احوال، نیت اور عادات انسانی کے اختلاف کے ساتھ وابستہ ہے۔ انھوں نے اسی واضح حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ معاشرہ انسانی اور قانون کا باہمی رشتہ نہ جاننے کے باعث لوگوں میں ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ جس نے شریعت اسلامی کا دائرہ بالکل محدود کر دیا ہے حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھے کہ جس شریعت میں مصالح انسانی کا سب سے زیادہ لحاظ رکھا گیا ہو۔ اس میں ایسی تنگ نظریوں کی گنجائش نہیں۔[6]

ہمیں یہ بات ہرگز نہ بھولنی چاہیے کہ جس حقیقت کو مونتسکیو[7] وغیرہ مغربی علمائے قانون نے اب واضح کیا ہے۔ اسے ان سے تقریباً

---

[1] دیکھو اسنوی کی شرح منہاج (جلد ۳ صفحہ ۱۰۸) [2] دیکھو شاطبی کی تصنیف اعتصام (جلد ۲ صفحہ ۱۱۲) [3] دیکھو اعلام الموقعین (جلد ۳ صفحہ ۱) [4] دیکھو مقدمہ ابن خلدون (صفحہ ۲۲) [5] دیکھو اعلام الموقعین میں بحث مذکورہ [6] دیکھو اس کی کتاب "روح الشرائع"

DE.L.ESPRIT DES LOIS جلد ۱ باب ۱۰-۱۹۔

چارسو برس پہلے ہی ابن القیم جوزیہ نے اور ابن خلدون وغیرہ علمائے عرب نے چودھویں صدی عیسوی (مطابق آٹھویں صدی ہجری) میں بے نقاب کردیا تھا۔[1]

تقریباً یہی مضمون قواعد مجامع کی عبارت کا ہے۔ جیسے مجلۃ الاحکام العدلیہ کی دفعہ ۳۹ میں نقل کیا گیا ہے کہ "لاینکر تغیر الاحکام بتغیر الزمان" یعنی یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زمانہ بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ اس قاعدے کی تکمیل کے لئے یہ الفاظ اور اضافہ کردینا چاہئیں، "وبتغیر الامکنۃ والاحوال" یعنی تغیر مکان اور تغیر حالات سے بھی احکام بدل جاتے ہیں۔ جیسے کہ فقہا نے اس کی تصریح کی ہے۔

قاعدہ مذکورہ کی رو سے ان مصالح کا تلاش کرنا ضروری ہے۔ جن پر احکام شرع کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اور چونکہ مصالح عامہ بھی احکام شرع کی بنیاد ہیں۔ تو اس دلیل سے یہ دعوے بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب وہ بنیاد باقی نہ رہے یا بدل جائے تو وہ احکام بھی بدلنے چاہئیں جو اس پر مبنی تھے۔ لہذا قواعد اساسی میں کہا گیا ہے۔ "ان الحکم الشرعی المبنی علی علۃ یدور مع علۃ وجوداً وعدماً" یعنی جو حکم شرعی کسی سبب پر مبنی ہو۔ وہ اس سبب کے وجود وعدم وجود کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ مولا علائی نے کہا ہے۔ "ان الحکم الشرعی مبنی علی علۃ فبانتہا نہا ینتھی"[2] یعنی جو حکم شرعی کسی سبب پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اس سبب کے ختم ہو جانے سے ختم ہو جاتا ہے۔[3]

احکام واجتہاد کی تبدیلی کی مثالیں

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارے بیان کردہ اصول کے اثرات پہلے تبدیلی آراء اور اختلاف مذاہب کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ پھر فتادیٰ اور احکام کی تبدیل شدہ صورت میں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ امام شافعی نے مختلف ملکوں کی معاشرت سے متاثر ہو کر کیونکر اپنا قدیم عراقی مذہب ترک کرکے جدید مصری مذہب اختیار کیا۔ اسی طرح کیا ابو یوسف کے عہد[4] میں تبدیلی بلکہ ارتغیرات حالات کی وجہ سے خراج اس مقدار سے کم نہ ہو گیا۔ جو عمر بن خطاب کے عہد میں مقرر تھا۔

فرعی مسائل میں فتادیٰ اور احکام کی تبدیلی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ان میں سے متاخر فقہائے حنفیہ کا یہ نظریہ ہے کہ ائمہ مذہب نے بہت سے مسائل فقہیہ میں اپنے زمانے کے رسم ورواج کو پیش نظر رکھ کر اجتہاد کیا ہے۔ اگر ان کے زمانے کا رواج مختلف ہوتا تو اپنے فتوے سے مختلف فتوے دیتے۔

چنانچہ علمائے متاخرین نے رواج بدل جانے کی صورت میں باقتضائے ضرورت مسائل فرعیہ میں ظاہر الروایۃ کے خلاف فتوے دینے

---

[1] دیکھو ہماری کتاب "آراء ابن خلدون الاقتصادیۃ" (فرانسیسی زبان میں) مطبع پیرس ۱۹۳۲ء صفحہ ۹۹، ۱۰۰

[2] دیکھو مجامع اور اس کی شرح منافع ص۳۳۳۔ [3] دیکھو منافع شرح مجامع ص۳۱۹ اسی طرح کا مضمون الامثال الاتینیۃ میں مذکور ہے RATIONE LEGIS CSSANLA CESSAT LEX [4] دیکھو کتاب الخراج لابی یوسف مطبوعہ بولاق ۱۳۰۲ھ ص۴۸۔

کو جائز قرار دیا ہے۔

ملاحظہ کیجئے چند مثالیں جو رسالہ "نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف" تالیف ابن عابدینؒ نیز دیگر کتب احناف سے اقتباس کی گئی ہیں۔ عہد اسلام کے درسادل میں اساتذہ کے بڑے بڑے وظائف مقرر تھے۔ اس بناء پر ابو حنیفہ اور صاحبین نے قرآن اور اس جیسی دینی کتابیں پڑھانے کی اجرت لینے کو ممنوع قرار دیا تھا۔ مگر جب اساتذہ کے وظائف موقوف ہو گئے تو متاخرین میں سے بڑے بڑے علمائے مذہب نے رواج بدل جانے کے سبب اس قسم کی اجرت کے جواز کا فتویٰ دیا۔

اسی طرح علمائے متاخرین نے یہ فتویٰ دیا کہ یتیم کی اور وقف شدہ جائداد کے غصب کرنے والے پر اس منافع کا بھی تاوان لازم ہوگا جو جائداد مغصوبہ سے حاصل ہوا ہے۔ حالانکہ یہ فتوائے مذہب حنفی کے اس قاعدے کے خلاف ہے کہ منافع کا تاوان واجب الادا نہیں۔ نیز متاخرین نے فتویٰ دیا کہ وقف شدہ اور یتیم کی سکنی جائداد کو ایک سال سے زیادہ اور غیر سکنی کو تین سال سے زائد عرصہ کے لئے کرایہ پر دینا جائز نہیں۔ حالانکہ یہ فتوائے مذہب حنفی کے اصل قاعدے کے خلاف ہے۔ پس یہ فتوائے اسی اصول کی بناء پر دیا گیا کہ زمانہ بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

دیگر مثال:۔ قدیم زمانہ میں مکانات کے تمام حصے ایک ہی نمونے کے بنائے جاتے تھے۔ اس لئے یہ طریقہ مروج تھا کہ جب خریدار مکان کے ایک کمرے کو دیکھ لیتا تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس نے پورا مکان دیکھ لیا۔ اور خیار رؤیت جو خریدار کو مذہب حنفی کی رو سے حاصل ہوتا تھا۔ وہ بھی باقی نہ رہتا تھا۔ یعنی وہ بیع کو فسخ نہ کر سکتا تھا۔ لیکن علمائے متاخرین کے زمانہ میں معماروں کا طرز تعمیر پہلے سے بدل گیا تھا کہ وہ ایک مکان کے مختلف حصے کو مختلف نمونے کے بناتے تھے۔ لہٰذا متاخرین علماء نے فتوائے دیا کہ خریدار کے لئے مکان کا ہر حصہ دیکھنا ضروری ہے۔ ہاں اگر مکان کے تمام حصے ایک ہی نمونے کے بنے ہوئے ہوں تو مکان کے تمام حصے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہی فیصلہ مجلۃ الاحکام العدلیہ کی دفعہ ۳۲۶ میں مذکور ہے۔

احکامِ نصوص کی تبدیلی

تبدیلی احکام کا جو اصول ہم نے اوپر بیان کیا۔ وہ قوانین قدیمہ وجدیدہ دونوں کی تاریخ سے ثابت ہے بلکہ وہ قوانین عصریہ میں تو پوری آزادی کے ساتھ مروج ہے۔ چونکہ یہ قوانین انسانوں کے وضع کردہ ہیں۔ لہٰذا جس طرح وضع کئے جاتے ہیں اسی طرح تبدیل بھی کر دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک صریح حکم دوسرے صریح حکم سے منسوخ ہو جاتا ہے۔ رہا اہل اسلام کا معاملہ تو جمہور فقہاء مجتہدین نے تبدیلی احکام کے اصول کو تو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن تبدیلی احکام کے جواز میں اس وقت ان کا اختلاف ہے۔ جب کسی مسئلہ کے متعلق قرآن یا سنت کی نص قطعی موجود ہو۔ یہ دشواری اس لئے پیش آتی ہے کہ اسلامی قانون اور اس کے ماخذ شرعیت الٰہیہ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن اور احادیث دونوں میں عمل نسخ پایا جاتا ہے۔[1] اور نسخ کا مفہوم، اس کے اسباب وعلل اور شرائط ہم پچھلے

---

[1] مطبوعہ مطبع معارف سوریا ۱۳۰۱ھ صـ۱۲۔ اور اس کے بعد سے قرآن میں کہیں نسخ نہیں پایا جاتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں ایسا عقیدہ چلا آ رہا ہے۔ لیکن یہ عقیدہ از روئے قرآن صحیح نہیں ہے۔ (طلوعِ اسلام)

باب میں بیان کر چکے ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ نسخ جائز ہے کیونکہ ایسا واقع میں ہو چکا ہے۔ اور عمل ایک نص سے دوسری نص کی ترمیم شمار ہوتا ہے۔ مگر یہاں سوال یہ ہے کہ آیا قرآن وسنت کے کسی حکم میں اجتہاد، انسانی قانون سازی، رواج یا کسی اور طریقہ سے ترمیم جائز ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب بہت دقیق اور تفصیل طلب ہو۔ پس اگر قرآن وسنت کا کوئی حکم دین وعبادت کے متعلق ہے تو وہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک یہ زمین ہے اور آسمان (یعنی قیامت تک) کیونکہ اصول دین اور توحید وایمان کے ضابطے حقیقی ہیں اور ناقابل تبدیلی، نیز ازلی وابدی ہیں۔ ان تمام ضابطوں میں نص کے حکم کی اطاعت لازمی ہے۔[1] اور چونکہ دین ہر متنفس اور ہر اس شخص کے لئے ہو، جو روئے زمین پر کہیں پیدا ہوا ہو قیامت تک کے لئے ضروری ہے۔ لہذا اس پر زمان ومکان اور حالات کی تبدیلی کا کوئی اثر نہ ہوگا اور دینی مسائل میں جو کچھ قرآن وسنت سے ثابت ہے وہ ہر زمانہ میں ہر جگہ اور ہر حال میں باقی رہے گا[2]

لیکن قرآن وسنت کا جو حکم معاملات دنیاوی سے متعلق ہو[3]، اس کے بارے میں اصول یہ ہے کہ اس کا منشاء ومفہوم اور اس کے اسباب وعلل سمجھنے چاہئیں۔ جیسا کہ ہم مقاصد شریعت اور قانون سازی کے فلسفہ کی بحث میں بیان کر چکے ہیں، یہاں تک تو جمہور فقہاء آپس میں متفق ہیں۔ مگر ان دنیاوی احکام کے بدلنے میں اختلاف ہے جو قرآن وسنت سے ثابت ہوں۔ پس بعض تو اسے قطعی ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک بعض صورتوں میں تبدیلی جائز ہے۔

مسئلہ مذکور میں فقہاء مذکور کی صحیح رائے یہ ہے کہ قرآن وسنت کے صریح حکم کی مخالفت کبھی جائز نہیں۔ اور نہ ان کے نزدیک کوئی شرعی حکم حالات کے بدلنے سے بدلا جا سکتا ہے۔ بلکہ انھوں نے نص کے مخالف فتوے قبول کرنے اور دقت ومشقت کو رفع کرنے کی صرف انھیں مسائل میں اجازت دی ہے جن کے متعلق قرآن یا حدیث کا صریح حکم موجود نہ ہو۔

امام ابو حنیفہ، امام محمد، امام شافعی اور داؤد ظاہری وغیرہ[4] کا یہی مذہب ہے۔ اور اسی مذہب کی تائید امام شافعی کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ "اذا رویت عن رسول اللہ حدیثا فلم اخذ بہ فاعلموا ان عقلی قد ذہب"[5] یعنی جب مجھے رسول کریم کی کوئی حدیث پہنچے اور میں اس پر عمل نہ کروں تو سمجھ لینا کہ میری عقل جاتی رہی ہے۔ ابن حزم ظاہری نے بھی نص کا حکم بدلنے کو اسی طرح ناجائز قرار دیا ہے: "جمیع نص اوجب النقل عنہ .... لتبدل حال عن احوالہ او لتبدل زمانہ او مکانہ فہذا ہو الباطل"[6] یعنی اگر کسی نص کا حکم بلا دوسری نص کے حالات یا زمانہ یا جگہ کی تبدیلی کے باعث بدلا جائے تو جائز نہیں۔

---

[1] دیکھو موافقات جلد ۲ صفحہ ۳۰۳ اور اس کے بعد۔ [2] دیکھو احکام لابن حزم جلد ۵ صفحہ ۵۔ [3] دینی اور دنیاوی معاملات میں تفریق کرنا غیر قرآنی تصور ہے اور اسلام کی روح کے خلاف (طلوع اسلام)۔ [4] دیکھو کتاب الام (جلد ۷ صفحہ ۲۷۵) اور دیکھو مستصفیٰ (جلد ۲ صفحہ ۱۳۹) اور دیکھو اعلام الموقعین (جلد ۲ صفحہ ۲۰۰ اور اس کے بعد) اور دیکھو الاشباہ والنظائر لابن نجیم (صفحہ ۲۳)۔ [5] دیکھو اعلام الموقعین (جلد ۲ صفحہ ۲۱۰)۔ [6] دیکھو الاحکام فی اصول الاحکام (جلد ۵ صفحہ ۲)۔

باوجود اقوال مذکورہ کے بعض خلفاء، ائمہ اور فقہائے اسلام ایسے گذرے ہیں جنھوں نے سبب بدل جانے، یا اس رواج کے بدل جانے جس پر نص مبنی تھی یا ضرورت و مصلحت کے پیش نظر پوری نص یا بعض نص کے حکم کو تبدیل کیا ہے۔ چند تائیدی مثالیں ملاحظہ ہوں جو مجھے فقہ اسلامی کی کتابوں میں ملی ہیں، اور جنھیں میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ یہ واضح رہے کہ مثالیں صرف یہی نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ میں انھیں مع اصلی ماخذوں کے بغیر تنقید و تبصرہ کے اور بلا کسی مذہب کی طرفداری کے مختصراً بیان کروں گا۔

اولیات عمر بن خطاب

خلیفہ فاروق عمر بن خطاب بلاشبہ حکومت اسلامیہ کے بانی تھے۔ اور اپنی عادلانہ اور جرأت مندانہ حکومت کے لئے مشہور تھے۔ آپ کے عہد خلافت میں حکومت اسلامی بہت قوی الاقتدار تھی جس میں رعایا کے حقوق اور مصالح کا بدرجہ اتم خیال رکھا جاتا تھا۔

عمر بن خطاب کا پورا عہد خلافت عظیم الشان فتوحات اور نمایاں تغیرات سے مملو ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی نئی ضروریات پیدا ہو گئیں اور پرانے رسم و رواج بدل گئے۔ اس لئے نبی کریمؐ اور خلیفہ ابوبکر صدیق کے بعض احکام بتقاضائے ضروریات و رواجات تبدیل کرنے پڑے۔ عمر فاروق اس معاملہ میں اس قدر محتاط اور اولوالعزم انسان تھے کہ سیاست ملکی اور رفاہیت عامہ کے پیش نظر مخالفت نصوص سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ہم اس کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

پہلی مثال:- المولفۃ قلوبہم (جن کی تالیف قلوب کی گئی ہو)

سب جانتے ہیں کہ قرآن کریم نے صدقہ اور خیرات کا مصرف اس آیہ کریمہ[1] میں معین کر دیا ہے:- "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ"[2] یعنی صدقات تو حق ہے صرف غریبوں کا، محتاجوں کا، صدقہ وصول کرنے والوں کا، ان مسلمانوں کا جن کی دلجوئی منظور ہے، غلاموں کے آزاد کرانے میں، اخراجات جہاد میں، اور مسافروں کی مدد کرنے میں یہ حق اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔ مولفۃ قلوبہم[3] وہ لوگ تھے جنھیں نبیؐ اس لئے خیرات عطا فرمایا کرتے تھے۔ تاکہ دلجوئی کر کے انھیں اسلام پر قائم رکھیں۔ دلجوئی خواہ ان کے ضعف ایمان کے سبب سے ہو یا ان کا شر دفع کرنے کی غرض سے یا ان کے قبیلہ میں ان کے مرتبے کے پیش نظر[4]

باوجود اس صریح نص قرآنی کے عمر بن خطاب نے "مولفۃ قلوبہم" کا حصہ موقوف کر دیا۔ اور ان سے فرمایا کہ یہ وظیفہ رسول اللہ صلعم تمہیں اس لئے عطا فرماتے تھے کہ تمہاری دلجوئی کر کے تمہیں اسلام پر قائم رکھیں۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو طاقتور بنا دیا ہے

---

[1] سورہ توبہ (پ۱۰) [2] فقرا و مساکین سے مراد محتاج لوگ ہیں، عاملین سے مراد صدقہ وصول کرنیوالے۔ فی الرقاب سے مراد غلاموں کی آزادی، فی سبیل اللہ سے مراد مجاہدین اسلام اور ابن سبیل سے مراد جو سفر میں تنہا رہ گیا ہو۔ دیکھو امام فخر الدین رازی کی تفسیر (جلد ۴، صفحہ ۴۰-۴۴۴) اور دیکھو تفسیر جلالین (جلد ۱، صفحہ ۲۲۲) [3] دیکھو ان کے نام ابن قتیبہ کی کتاب المعارف میں (صفحہ ۱۲۹) [4] دیکھو اس کی تفصیل مع اختلاف مذاہب فتح القدیر میں (جلد ۲، ۱۴-۱۵) اور شرح الکبیر (جلد ۱، صفحہ ۴۹۲ اور اس کے بعد) اور دیکھو مجموعہ شرح مہذب (جلد ۶، صفحہ ۱۹۷ اور اس کے بعد)

اور تم سے بے نیاز کردیا ہے۔ پس اگر تم اسلام پر قائم رہو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ ہم اسلام کے معاوضہ میں تمہیں کچھ نہ دیں گے۔ لہٰذا جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کافر ہو جائے۔[1]

پس اس زمانہ میں آیت مذکورہ کا حکم اشاعت اسلام اور اسے مدد پہنچانے کی مصلحت پر مبنی تھا۔ جب اسلام طاقتور ہو گیا تو یہ ضرورت ختم ہو گئی چنانچہ حضرت عمر بن خطاب نے اس حکم کو منسوخ کر دیا جو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔

دوسری مثال :۔ جب شوہر اپنی بیوی کو ایک ہی نشست میں تین بار طلاق دیدے۔ تو رسول اللہ صلعم۔ ابوبکر صدیق، اور عمر بن خطاب کے اوائل خلافت میں وہ ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھی۔ اور اس وقت یہی طریقہ رائج تھا۔[2] اور بعد میں اسی پر اجماع ہو گیا تھا۔

باوجود اس کے عمر بن خطاب نے ایسی طلاق کو طلاق بائن قرار دیا گویا مرد کے لفظوں کے مطابق تین طلاقیں۔ وجہ یہ تھی کہ جب عمر بن خطاب نے دیکھا کہ لوگوں نے اس قسم کی طلاقوں کو ایک کھیل بنا لیا ہے۔ اور ایسی طلاقیں بکثرت دی جانے لگی ہیں تو آپ نے انہیں سزا دینے اور اس بری عادت سے روکنے کی غرض سے یہ تبدیلی کر دی۔

عمر بن خطاب نے اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس رائے کو بہتر سمجھا تھا۔ اسے بعض فقہاء نے اپنے زمانہ کے حالات کے اعتبار سے بہتر نہ سمجھا۔ اور انھوں نے تغیر احکام کے اصول کے مطابق سنت نبوی کی طرف رجوع کرنا مناسب خیال کیا۔[3]

معاصرین میں سے ایک بڑے فاضل[4] نے عمر بن خطاب کے اس عمل پر تبصرہ کیا ہے کہ عمر کا یہ نص ایک ہنگامی حکم کی حیثیت رکھتا ہے جو امام وقت (عمر) نے بضرورت سیاست دیا تھا۔ فاضل مذکور نے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو احکام قرآن یا سنت کی نص صریح سے ثابت ہیں۔ انھیں نہ کسی کو تبدیل کرنے کا حق ہے۔ اور نہ کوئی ان احکام کے علاوہ کسی دوسرے حکم کو اختیار کرنے کا مجاز ہے۔ خواہ ایک شخص ہو یا پوری جماعت۔

تیسری مثال :۔ امہات الاولاد کو فروخت کرنا۔

امہات الاولاد وہ لونڈیاں کہلاتی ہیں۔ جن کے ہاں اپنے آقاؤں سے اولاد پیدا ہو جائے۔ ایسی لونڈیوں کی بیع نبی صلعم اور ابوبکر صدیق کے زمانہ میں جائز تھی۔ لیکن عمر بن خطاب نے یہ فرماتے ہوئے ان کی بیع ممنوع قرار دی کہ خالطت دماءنا دماءھن۔ یعنی ہمارے خون ان کے خون سے مخلوط ہو گئے ہیں۔

---

[1] دیکھو فتح القدیر میں یہی بیان [2] اس اثر کو بیہقی نے روایت کیا۔ دیکھو مجموع میں یہی بیان [3] دیکھو حدیث ابن عباس، صحیح مسلم میں بشرح نووی (جلد ۱۰ صفحہ ۷۰) [4] دیکھو اعلام الموقعین (جلد ۳ صفحہ ۴۴-۴۳) اور دیکھو قانون مصری نمبر ۲۵-۱۹۲۹۔ [5] فضیلت مآب شیخ احمد محمد شاکر نے اپنی کتاب نظام الطلاق فی الاسلام میں لکھا ہے۔ مطبوعہ مصر ۱۳۵۴ ص نمبر ۹۰۔

یہ بہت گرانقدر رقم ہے جیسا کہ ابن رشد الحفید کا مقولہ ہے۔ کہ یہ بات اخلاق کریمانہ سے بعید ہے کہ آدمی اپنی ام ولد کو فروخت کرے۔ درانحالیکہ سرور عالم صلعم نے فرمایا ہے بعثت لاتمم مکارم الاخلاق: یعنی میں تمہارے پاکیزہ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں[1]۔

چوتھی مثال:۔ چوری:۔ شرع اسلامی میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ بروئے آیت وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا[2]: یعنی چرانے والے اور چرانے والی کا ہاتھ کاٹ دو اور بدلیل سنت نبوی قولی وفعلی۔ لیکن عمر بن خطاب نے قحط کے سال لوگوں کی ضرورت اور ان کی بقا کے پیش نظر اس سزا کو موقوف کر دیا۔ اور اسی پر فقہا کا اجماع ہے[3]۔

پانچویں مثال:۔ زنا:۔ غیر شادی شدہ زانی کی سزا جمہور فقہا کے نزدیک سو کوڑے اور پورے ایک سال کی جلاوطنی ہے۔ اور شہر بدر کرنا حدیث مشہور سے ثابت ہے[4]۔ لیکن باوجود صریح نص کے عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ آپ نے ربیعہ بن امیہ بن خلف کو شہر بدر کیا تو وہ روم میں جا ملا۔ اس پر عمر بن خطاب نے فرمایا "لا اغرب بعدھا احدا[5]" اس کے بعد میں کبھی کسی کو شہر بدر نہ کروں گا۔ آپ کا یہ فیصلہ اس غرض سے تھا کہ مسلمان دشمنوں سے نہ جا ملیں۔ حالانکہ یہ فیصلہ نص صریح کے بالکل خلاف ہے۔

چھٹی مثال:۔ تعزیر:۔ تعزیر کے شرعی معنی اس سزا کے ہیں جو حاکم وقت تادیباً کسی ایسے جرم کے لئے تجویز کرتا ہے جس کے لئے شرع اسلامی میں کوئی سزا مقرر نہ ہو۔ حدیث میں وارد ہے کہ لا یجلد فوق عشر جلدات الا فی حد من حدود اللہ[6] یعنی کسی جرم میں دس کوڑوں سے زیادہ سزا نہ دی جائے۔ سوا ان چیزوں کے جو اللہ کی طرف مقرر ہیں۔ اس نص صریح کے باوجود عمر بن خطاب سے روایت ہے کہ آپ نے اس شخص کو سو کوڑوں کی سزا دی تھی جس نے بیت المال کی جعلی مہر بنائی تھی۔

بعض فقہاء نے حدیث مذکور کو منسوخ قرار دیا ہے۔ لیکن امام مالک کے اصحاب نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ حدیث نبی صلعم کے زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ لہذا اور زمانوں میں قابل عمل نہیں ہو سکتی[7]۔ ائمہ مذکورین کے اقوال سے یہ واضح ہو گیا کہ بعض منصوص احکام وقتی ہوتے ہیں۔ جو زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

ساتویں مثال:۔ عاقلۃ الدیۃ (خون بہا کے ذمہ دار لوگ) سب جانتے ہیں کہ بعض اوقات خون بہا کی ادائیگی ایک خاص جماعت پر شرعاً واجب ہوتی ہے۔ اور یہ خاص جماعت رسول اللہ صلعم کے عہد میں قاتل کا قبیلہ ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ مدرسہ حجاز کے فقہاء کا بھی یہی دستورالعمل رہا۔

---

[1] دیکھو بدایۃ المجتہد جلد ۲ ص ۳۳۶ [2] سورہ مائدۃ (۵/۳۸) [3] دیکھو اعلام الموقعین (جلد ۳ ص ۷-۹) [4] دیکھو نیل الاوطار (جلد ۷ ص ۷۳ اور اس کے بعد) [5] دیکھو تفسیر فخر الدین رازی (جلد ۶ ص ۲۱۷) [6] اخراج کیا اس حدیث کو بخاری، مسلم، احمد اور چار حدیث کی کتابوں کے مولفین نے مع لفظی اختلاف کے۔ دیکھو صحیح بخاری بشرح عینی (جلد ۲۴ ص ۲۳) اور دیکھو صحیح مسلم (جلد ۵ ص ۱۳۶) دیکھو سنن ابو داؤد (جلد ۴، نمبر ۴۴۹۱) دیکھو جامع الصغیر للسیوطی (جلد ۲ نمبر ۹۹۵۱) [7] دیکھو صحیح مسلم کی شرح نوذی (جلد ۱۱ ص ۲۲۱-۲۲۲)

لیکن عمر بن خطاب کے زمانہ میں یہ طریقہ بدل گیا۔ کیونکہ جب عمر بن خطاب نے فوج اور دیوان کی تنظیم کی اور تمام جنگی طاقت قبائل سے منتقل ہو کر محکمہ فوج کے ہاتھ میں آ گئی تو عمر بن خطاب نے عہد نبوی (صلعم) کے طریقے کے خلاف مقتول کا خون بہا قاتل کے قبیلے سے ساقط کر دیا۔ اور اہل دیوان کے ذمہ ڈال دیا۔ چنانچہ آپ ہی کی اتباع کو عراق کے فقہاء نے بھی اختیار کیا۔

سرخسی نے اس تبدیلی کو مستحسن قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ۔ اگر کہا جائے کہ صحابہ کے متعلق یہ گمان کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کا اجماع رسول اللہ (صلعم) کے فیصلہ کے خلاف ہوا تھا تو ہم جواب دیں گے کہ صحابہ کا اجماع رسول اللہ صلعم کے خلاف نہ تھا بلکہ موافق تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلعم نے مقتول کا خون بہا قاتل کے قبیلے کے ذمے اس لئے مقرر فرمایا تھا کہ اس زمانہ میں آدمی کی قوت و نصرت کا انحصار قبیلے ہی پر تھا۔ لیکن جب عمر بن خطاب نے باقاعدہ فوجی تحریک قائم کر دیا تو لوگوں کی طاقت اور مدد کا مرکز فوجی محکمہ بن گیا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات لوگ دیوان یعنی محکمہ فوج کی طرف سے اپنے قبیلے سے جنگ کرتے تھے۔ مگر اس توجیہہ کو امام شافعی نے نہیں کیا انھوں نے فرمایا کہ چونکہ رسول اللہ (صلعم) کے عہد مبارک میں خون بہا کا ذمہ دار قاتل کا قبیلہ ہوا کرتا تھا۔ اس لئے آنحضرت صلعم کے تعامل کے خلاف کوئی فیصلہ قابل اعتبار نہیں ہو سکتا[1]

بعض خلفاء کی اولیات

تبدیلی سنت کی مثالوں میں سے ایک بخاری کی روایت ہے۔ جو انھوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز سے روایت کی ہے کہ خلیفہ مذکور نے کہا "کانت الهدیة فی زمن رسول اللہ صلعم هدیة والیوم رشوة"[2] یعنی ہدیہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں ہدیہ تھا۔ اور آجکل وہ رشوت کے حکم میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلعم۔ ابوبکر صدیق اور عمر بن خطاب لوگوں کا تحفہ قبول فرماتے تھے۔ مگر عمر بن عبدالعزیز نے ہدیہ قبول نہ کیا۔ اور اسے ایک قسم کی رشوت سمجھ کر اس کا لینا برا سمجھا۔

تبدیلی کی ایک مثال ذمی کا خون بہا بھی ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ذمی کا خون بہا مسلمان کے خون بہا کے برابر ہے امام مالک اور امام حنبل کے نزدیک ذمی کا خون بہا مسلمان کے خون بہا سے نصف ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک ایک تہائی ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق بیہقی نے زہری سے ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلعم، ابوبکر صدیق، عمر و عثمان کے زمانہ میں عیسائی اور یہودی کا خون بہا مسلمان کے خون بہا کے برابر ہوا کرتا تھا۔ معاویہ نے خون بہا کا نصف بیت المال کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ اور نصف مقتول کے ورثاء کے لئے۔ عمر بن عبدالعزیز نے بھی خون بہا کا نصف تو ورثائے مقتول کے لئے مقرر کیا تھا۔ اور نصف حصہ جو بیت المال کا حصہ تھا اسے معاف کر دیا تھا[3] پس ان واقعات سے معلوم ہوا کہ خلفاء کا عمل سنت اور عمل صحابہ سے مختلف ہے۔ دراصل اس تبدیلی کا مقصد اس وقت کی سیاست کا تقاضا تھا۔

امام ابو یوسف حنفی

جب کوئی شرعی حکم رسم و رواج پر مبنی ہو اور رسم و رواج بدل جائے تو کیا اس صورت میں شرعی حکم کا تبدیل کرنا جائز ہے۔ یا بالفاظ دیگر کیا اس حکم شرع کا اتباع واجب ہے۔ جو پہلے رسم و رواج پر مبنی تھا لیکن رسم و رواج کا

---

[1] دیکھو مبسوط جلد ۲۷ صـ ۱۲۵-۱۲۶۔ [2] دیکھو صحیح بخاری بشرح عینی جلد ۳ صـ ۱۵۳ [3] دیکھو نیل الاوطار جلد ۷ صـ ۵۵

مسئلہ مذکورہ میں امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک حکم شرع کا اتباع واجب ہے نہ کہ جدید رسم و رواج کا۔ لیکن بغداد کے قاضی القضاۃ ابو یوسف کی رائے ان کے خلاف ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک صورت مذکورہ میں استحساناً حکم شرع ترک کر دینا اور رواج کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ حکم شرع کا مطمح نظر رسم و رواج ہی تھا[1] مجلۂ احکام عدلیہ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ اپنے اس صریح حکم کی رو سے جو دو ضابطوں میں بیان کیا گیا ہے استعمال الناس حجۃ یجب العمل بھا ولا ینکر تغییر الاحکام بتغییر الازمان[2] یعنی لوگوں کا تعامل حجت ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے زمانہ بدلنے سے احکام کا بدل جانا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ نیز اس قرارداد[3] کی رو سے جو مجلہ کو مرتب کرنے والی کمیٹی نے صدر اعظم کے سامنے پیش کی تھی کہ انہ بتبدل الاعصار تتبدل المسائل التی یلزم بناءھا علی العرف والعادۃ یعنی زمانہ بدلنے سے وہ احکام بدل جاتے ہیں جو رسم و رواج پر مبنی ہوں۔

توضیحی مثال:۔ سب جانتے ہیں کہ جو اور گیہوں کیلی (ماپنے کی چیزیں) ہیں۔ اس حدیث کی رو سے "البر بالبر کیلاً بکیل والشعیر بالشعیر کیلاً بکیل[4] یعنی جو اور گیہوں پیمانوں سے ماپ کر فروخت کئے جائیں۔ چنانچہ پہلے جو اور گیہوں ماپ کر ہی فروخت کئے جاتے تھے۔ کیونکہ نبی کریمؐ کے زمانہ میں یہی رواج تھا۔

لیکن آنحضرت صلعم کے بعد جب یہ طریقہ بدل گیا تو اکثر شہروں میں گیہوں اور جو وزن کر کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فروخت ہونے لگے۔ اور آجکل بھی وزن ہی کا رواج ہے[5]۔ تو کیا یہ طریقہ حدیث مذکور کے مخالف ہونے کے سبب سے قابل قبول نہ ہوگا؟ امام ابو یوسف کے نزدیک یہ طریقہ ضرور قابل قبول ہوگا۔ اور اس کی وجہ شاید وہ عملی تجربات ہیں جو انہیں منصب قضا کے دوران میں حاصل ہوئے تھے۔

بلاشبہ امام ابو یوسف کا مسلک اس قدر معقول ہے اور نئی ضرورتوں اور جدید نظریوں[6] کے مطابق ہے نیز اس قاعدہ کلیہ کے بھی موافق ہے کہ کسی چیز کا وجود اور عدم وجود اس کے اسباب و علل کے تابع ہوتا ہے۔

اسی قاعدے کی بنا پر بعض فقہا نے اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ عربی مہینوں خصوصاً ماہ رمضان کی ابتدا شمسی حساب سے مقرر کی جائے۔ انھوں نے اپنی رائے کی توضیح اس طرح کی ہے کہ جس حدیث کی رو سے ماہ رمضان میں صرف رویت ہلال کا اعتبار کیا گیا ہے اس کا سبب دوسری حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "قوم ان پڑھ ہے نہ لکھنا جانتی ہے نہ حساب کرنا"۔ لیکن جب مسلمانوں کی جہالت دور ہو گئی اور وہ لکھنا پڑھنا اور حساب کرنا سیکھ کر اس قابل ہو گئے کہ بحساب شمسی آغاز ماہ کا بالکل صحیح تعین کر سکیں۔ تو اب انھیں جائز ہے کہ رویت ہلال کا پرانا طریقہ چھوڑ کر مہینوں کا تعین شمسی حساب سے کریں۔ اور رویت ہلال کا طریقہ صرف اسی صورت میں اختیار کریں۔ جب کسی اور ذریعہ سے علم نہ ہو سکے[7]۔

۱؎ دیکھو منافع (ص ۳۰۹ و ۲۲۴) دیکھو فتح القدیر اور اس کا حاشیہ عنایہ (جلد ۵ ص ۲۸۳) دیکھو موافقات (جلد ۲ ص ۲۸۳) ۲؎ دیکھو درر و غنیہ ۲، ۳۰۹ و شرح علی حیدر وغیرہ، ۳ ص ۳ ۳؎ دیکھو کتاب المغنی لابن قدامہ (جلد ۴ ص ۱۳۶) ۴؎ دیکھو فتح القدیر میں بیع الوقع اور دیکھو رسالہ نشر العرف لابن عابدین ص ۳ ۵؎ دیکھو دالوزگی قاموس الاجتہاد والعام جلد ۳ در ضمن قانون نمبر ۵ھ ۶؎ (REP. DE JURISPRUDENCE. VO. Loi ۵ ۴۵) ۷؎ فضیلت مآب احمد محمد شاکر نے اپنے رسالہ میں بیان کیا ہے جس کا نام "اوائل الشہور العربیہ" ہے۔ مطبوعہ مصر ۱۹۳۹ء ص ۱۳۔

امام قرافی مالکی

امام شہاب الدین ابو العباس احمد بن ادریس (متوفی سنہ ۶۸۴ھ) جو قرافی مصری کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ اپنے زمانہ میں مصر میں، مالکیوں کے سردار تھے[۱]۔ انھوں نے بہت سی تصنیفات کیں۔ جن میں مشہور یہ ہیں۔ کتاب الفروق چار جزوں میں کتاب الاحکام فی تمییز الفتاوی عن الاحکام وتصرفات القاضی والامام:

جیسا کہ کتاب الاحکام[۲] میں مذکور ہے ایک دفعہ امام قرافی سے سوال کیا گیا کہ جب معاشرے کے حالات بدل جائیں تو کیا وہ فتوے جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ بیکار ہو جائیں گے اور جدید تقاضوں کے مطابق فتوے دیے جائیں گے؟ یا یہ کہا جائے گا کہ ہم تو مقلد ہیں اور اہلیت اجتہاد نہ رکھنے کے باعث ہمیں یہ حق نہیں کہ کوئی نیا فتوے دے سکیں۔ لہذا ہم وہی فتوے دینگے جو ائمہ مجتہدین سے منقول ہیں۔

قرافی کا جواب یہ تھا۔ "چونکہ شرع کے تمام احکام اسباب و علل کے تابع ہیں۔ اس لئے رسم و رواج بدلنے سے شرع کا حکم بھی بدل جائے گا۔ اور اس قسم کی تبدیلی متقدمین کا نیا اجتہاد نہ کہلائے گا۔ جو اس میں اہلیت اجتہاد کی شرط مقرر کی جائے۔ بلکہ یہ تو ایسا قاعدہ ہے جس میں علما نے متفقہ طور پر اجتہاد کیا ہے۔ چنانچہ ہم بھی انہیں کا اتباع کرتے ہیں اور کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے۔

اس جواب کا تعلق بلا شبہ اجتہادی مسائل سے ہے نہ کہ تغیر نصوص سے لیکن جواب مذکور کے بعد ایک ضمیمہ علی الاطلاق وارد ہوا ہے جس کی عبارت یہ ہے۔ جمیع ابواب الفقہ المحمولۃ علی العوائد اذا تغیرت العادۃ تغیرت الاحکام فی تلک الابواب یعنی فقہ کے وہ تمام مباحث جو اسباب و علل پر مبنی ہیں۔ ان کے تمام احکام رسم و رواج بدل جانے سے متبدل ہو جائیں گے۔ اگر اس عبارت کو مطلق رکھا جائے تو اس میں بلا استثنائے تمام احکام داخل ہوں گے۔ اور اس لحاظ سے یہ عبارت ابو یوسف کے اس قول کے مطابق ہے جو ابھی گزرا۔

امام طوفی حنبلی

امام نجم الدین ابو الربیع سلیمان بن عبد القوی طوفی (متوفی سنہ ۷۱۶ھ) مذہب حنبلی کے مشہور علماء میں سے ہیں[۳]۔ نیز وہ ان ائمہ میں سے ہیں۔ جنھوں نے علی الاعلان مصلحت وقت کو نص و اجماع پر مقدم کیا ہے۔

امام مذکور نے حدیث "لا ضرر ولا ضرار"[۴] یعنی شریعت اسلامی کا مطمح نظر نقصان پہنچانا نہیں ہے کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب مصلحت وقت کا نص اور اجماع سے مقابلہ ہو جائے تو مصلحت کو نص و اجماع پر ترجیح دی جائے گی۔ اور نص و اجماع کو وقتی خصوصیت پر محمول کیا جائے گا۔

امام طوفی کا اصول مذکورہ امام مالک کے مصالح مرسلہ جیسا نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ وسیع ہے۔ اس اصول کا مفہوم یہ ہے کہ عبادات اور معتقدات تو ہر حیثیت سے نصوص و اجماع پر موقوف ہیں لیکن معاملات دنیاوی مصالح عامہ سے وابستہ ہیں۔ کیونکہ لوگوں کے سیاسی

---

[۱] دیکھو حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاہرہ للسیوطی جلد ۱۔ ص ۱۲۰ [۲] مطبع انوار مصر ۱۹۳۸ ص ۸۶-۸۸ [۳] دیکھو ان کے ترجمہ مختصر طبقات الحنابلہ میں ص ۵۲

[۴] یہ حدیث نجد الاحکام عدلیہ کی دفعہ ۱۹ میں نقل کی گئی ہے۔ یہ حدیث حسن ہے جسے امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں، امام مالک نے اپنی موطا میں اور حاکم نے اپنی مستدرک میں بیان کیا ہے نیز بیہقی۔ ابن ماجہ اور دار قطنی نے بھی بیان کیا ہے۔ دیکھو جامع الصغیر تالیف سیوطی (جلد ۲ نمبر ۹۸۹۹) دیکھو ابہاج شرح منہاج تالیف سبکی (جلد ۳۔ ص ۱۰۸) نیز دیکھو اشباہ والنظائر تالیف سیوطی (ص ۵۹-۶۰)

اور معاشرتی مسائل کی مصلحتوں کا معیار رسم و رواج اور استصواب عقلی ہے۔ پس جب ہمیں کسی دنیاوی مسئلہ کا حکم شرع میں نہ ملے تو ہم مصلحت عامہ سے استصواب کر سکتے ہیں[۱]۔

بحث مذکور کا خلاصہ یہ ہے کہ امام نجم الدین طوفی نے رسالہ مصالح مرسلہ میں حدیث "لاضرر ولا ضرار" کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ گویا ہر صریح حکم کے بعد یہ کہا گیا ہے: "بشرطیکہ مصلحت وقت اس کے خلاف نہ ہو[۲]"۔

آخری کلمات۔ زمان و مکان اور حالات بدلنے کے سبب احکام بدلنے کی صحیح مثال ابن القیم جوزیہ کی یہ روایت ہے کہ انھوں نے اپنے شیخ ابن تیمیہ کو یہ واقعہ بیان کرتے سنا کہ "میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تاتاریوں کے زمانہ میں ان کے ایک ایسے گروہ کے پاس سے گذرا جو شراب پی رہے تھے۔ میرے ساتھیوں کو یہ بہت ناگوار گذرا۔ میں نے ان سے کہا کہ "اللہ تعالیٰ نے شراب صرف اس لئے حرام کی ہے کہ وہ اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے۔ اور ان لوگوں کو شراب، قتل و غارت گری، لوگوں کو قید کرنے اور ان کا مال و اسباب لوٹنے سے روکے ہوئے ہے۔ لہٰذا انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو[۳]"۔ یہ مثال جیسا کہ آپ دیکھیں گے۔ اس قاعدہ کی جزوی مثال ہے کہ "یختار اہون الشرین": دو برائیوں میں سے کم درجہ کی برائی اختیار کرنی چاہیئے۔ اس قاعدہ کی مزید وضاحت ہم ضرورت کے باب میں کریں گے۔

خلاصہ اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ان آراء کا خلاصہ ہے جو اس بارے میں ہیں کہ شرعی احکام لوگوں، انسانوں کے حالات کے لحاظ سے بدل جاتے ہیں۔ یہاں ان امور کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جن سے مختلف آراء کے اختلاف کی اہمیت بہت کم رہ جاتی ہے۔ اور وہ حسب ذیل ہیں۔

اول۔ اختلاف صرف چند مسائل میں ہے۔ کیونکہ وہ نصوص جو معاملات کے متعلق ہیں۔ بہ نسبت ان نصوص کے جو عبادات کے متعلق ہیں۔ بہت قلیل ہیں۔

دوم۔ جن احکام میں تبدیلی اور ترمیم ہوئی ہے۔ وہ اکثر جزوی مسائل ہیں اور ایسے قواعد کلیہ نہیں ہیں جو اصولی حیثیت سے تمام ملکوں اور ہر زمانہ میں دستور العمل قرار دیئے جائیں۔

سوئم۔ فقہاء کے نزدیک رائے مختار یہ ہے کہ ضرورت کے وقت نصوص کی مخالفت جائز ہے۔ کیونکہ ضرورت ممنوع چیز کو بھی مباح کر دیتی ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ باب میں واضح کریں گے۔

چہارم۔ بہت سے نصوص جو سنت کی طرف منسوب ہیں، سنت نہیں، جیسا کہ ہم گذشتہ باب میں وضع حدیث کے بیان میں

---

[۱] دیکھو کتاب یسر الاسلام و اصول التشریع العام، تالیف محمد رشید رضا (صفحہ ۷۲-۷۳) [۲] دیکھو مجلہ منار کی جلد نہم (صفحہ ۷۴۵-۷۷۰) [۳] یہ علامہ شیخ مصطفیٰ غلابینی کی تعلیق ہے۔ جو انھوں نے کلام طوفی پر لکھی ہے۔ دیکھو علامہ غلابینی کی کتاب "الاسلام روح المدنیہ" مطبوعہ بیروت چوتھا ایڈیشن ۱۹۳۵ء (صفحہ ۳۰۰) [۳] دیکھو اعلام الموقعین (جلد ۳ صفحہ ۳)

واضح کرچکے ہیں۔

پنجم۔ جو احادیث دنیاوی معاملات سے متعلق ہیں اور رسول اللہ صلعم کی ذاتی رائے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ واجب العمل نہیں اس کی دلیل صحیح مسلم کی یہ روایت ہے کہ ان النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مر بقوم یؤبرون[1] النخل: یعنی ایک مرتبہ رسول اللہ ایسے گروہ کے پاس سے گذرے جو نر کھجور کا گودا مادہ کھجوریں ڈال رہے تھے یہ دیکھ کر آنحضرت صلعم نے دریافت فرمایا ماذا یصنع ھولاء؟ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا کہ نر کا گودا مادہ میں ڈال رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا؟ لو لم یفعلوا لصلح اگر ایسا نہ کرتے تو اچھا ہوتا۔ چنانچہ جب ان لوگوں کو حضورؐ کے ارشاد کی خبر دی گئی۔ تو انھوں نے یہ عمل موقوف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں اچھی نہ ہوئیں۔ جب آنحضرت کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ انما انا بشر اذا امرتکم بشیئ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیئ من رائی فانما انا بشر انتم اعلم بامر دنیاکم[2] یعنی میں بھی انسان ہوں۔ جب میں تمہیں دین کے بارے میں کوئی حکم دوں۔ تو تم اس پر عمل کرو۔ اور جب میں (دنیاوی معاملات میں) اپنی رائے سے کوئی حکم دوں، تو میں بھی انسان ہوں اور تم اپنے دنیاوی معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔

نیز یہ کہ امثال مذکورہ میں احکام نصوص کی تبدیلی بنفسہٖ شرع اسلامی کی اس روح کے خلاف نہیں جس کا نصب العین لوگوں کے لئے سہولت پیدا کرنا اور رفاہیت عامہ ہو۔

آیہ کریمہ میں مذکور ہے يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ[3] یعنی اللہ تعالےٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ نیز حدیث شریف میں آیا ہے یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا[4]۔ یعنی سہولت پیدا کرو دشواری پیدا نہ کرو اور مانوس بناؤ اور دہشت نہ لاؤ۔ خذوا من العمل ما تطیقون[5] یعنی وہ کام کرو جو تمہارے مقدور میں ہو۔ ما نھیتکم عنہ فاجتنبوہ وما امرتکم بہ فافعلوا منہ ما استطعتم[6] یعنی جس کام سے میں تمہیں منع کروں اسے چھوڑ دو اور جسے کرنے کا حکم دوں، اسے حتی المقدور کرو۔

احکام کی تبدیلی سے مراد خدانخواستہ نصوص کی تبدیلی نہیں کیونکہ نصوص مقدسہ کو کسی صورت میں ہاتھ لگانا جائز نہیں۔ بلکہ تغیر احکام سے مقصود ان نصوص کی مختلف تفسیر ہے جو ضرورت کے سبب سے یا علل وعادات کے بدلنے سے لازم آئے۔

وہ تمام دلائل اور اقوال وغیرہ جو شرع اسلامی کے مستند ماخذ ہیں۔ قدیم روایات اور مختلف مذاہب کے علماء کی آراء پر مبنی ہیں

---

[1] یأبرون۔ یعنی بیج ڈالتے تھے۔ یا گرد اڈالتے تھے [2] صحیح مسلم (جلد ۲، ص ۹۵) اور اس کی شرح نووی (جلد ۱۵ ص ۱۱۶-۱۱۸)
[3] سورۂ بقرہ (پ ۲) [4] دیکھو بخاری اور اس کی شرح عینی (جلد ۲ ص ۴۷) نیز یہی حدیث کچھ لفظی تغیر کے ساتھ صحیح مسلم میں بھی آئی ہے (جلد ۵ ص ۱۴۱) [5] دیکھو بخاری اور اس کی شرح از عینی (جلد ۱۱ ص ۸۵) [6] دیکھو صحیح مسلم (جلد ۲، ص ۹۱) یہ حدیث باختلاف الفاظ صحیح بخاری میں بھی موجود ہے دیکھو شرح عینی (جلد ۲۵، ص ۳۱)

اس قاعدہ کلیہ کے جزئیات ہیں۔ جن کا ذکر اس باب میں کیا گیا ہے۔ سب کا خلاصہ یہ ہے کہ معاملات دنیاوی کے تمام مسائل معقول علل واسباب پر مبنی ہیں۔ اور سب کا مطمح نظر لوگوں کی فلاح و بہبود اور ضروریات رسم ورواج کی تکمیل ہے۔ دنیاوی مسائل اپنے وجود اور عدم وجود[1] کے اعتبار سے انھیں اسباب پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور رفاہیۃ عامہ واحتیاجات کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ نیز اختلاف ماحول۔ تغیرات عصریہ اور متبادل رسم ورواج سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔

بیان مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ شرع اسلامی اپنے تمام تاریخی ادوار میں معاشرہ انسانی کے نشوونما کے لئے کبھی سدراہ نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ ہر ملک اور ہر زمانہ کی معاشی اور اقتصادی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی رہی ہے۔ شرع اسلامی کو قائم رکھنے کے لئے عمر بن خطاب اور ابو یوسف جیسے باہمت اور عزم صمیم رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنھوں نے شرع اسلامی کے منشاء کو سمجھا اور اس کے مقصد اصلی کو پیش نظر رکھ کر ایسے زمانہ میں اسے رواج دیا۔ جب لوگوں پر جمود طاری نہ تھا بلکہ ہر فن کے ماہر نظر اور ماہر موجود تھے۔

شرع اسلامی کا مطمح نظر ہمیشہ وہ روح قانون رہی ہے جو مصالح اور رفاہیۃ عامہ اور عوام کی سہولتوں کے ذرائع کو بروئے کار لاسکے۔

شاید ہمارا بیان بعض مغربی مصنفوں کی بے اصل تحریروں اور غلط انگیزیوں کی تردید کر سکے گا۔ جس کے ذریعہ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شرع اسلامی ایک جامد[2] قانون ہے۔ جس میں عصر جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ان کے غلط خیالات کا اصلی سبب ان کی تنقیدی درماندگی اور شرع اسلامی کے ماخذوں سے لاعلمی ہے۔ نیز وہ شرع اسلامی کا حقیقی منشا سمجھنے سے بھی قاصر رہے ہیں[3] ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار۔ بیشک اس میں آنکھوں والوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔

---

[1] دیکھو قواعد الاحکام تالیف عز بن عبدالسلام (جلد ۲۔ صفحہ) [2] دیکھو کتاب مبادی الشرع الاسلامی الجزائری۔ تالیف زئس مطبوعہ الجزائر (جلد ۱۔ صفحہ ۹) ZEYS, TRAITE ELEMENTAIRE DE DROIT MUSULMAN [3] سورہ آل عمران (پ ۳)

فردوسِ گم گشتہ

از پرویز

ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف ۔ قیمت چھ روپے

طلوعِ اسلام کنونشن

اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور نوعِ انسانی کی نجات و سعادت کا راز اس نظام میں پوشیدہ ہے جو قرآن کریم نے متعین کیا ہے۔ اس نظام کی عملی تشکیل کی پہلی کڑی یہ ہے کہ قرآنی فکر کی عام نشر و اشاعت کی جائے۔ اس مقصد کے لئے بزمِ طلوعِ اسلام لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ امسال ۱۶-۱۷-۱۸ نومبر (جمعہ، ہفتہ، اتوار) کو مغربی پاکستان کی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے نمائندگان کا ایک مشاورتی اجتماع (کونشن) لاہور میں منعقد کیا جائے۔ جس میں غور کیا جائے کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

لہٰذا مغربی پاکستان کی تمام بزمہائے طلوعِ اسلام سے درخواست ہے کہ وہ براہِ کرم

(۱) اپنے اپنے حلقے سے ایک ایک دو دو احباب کو بطور نمائندہ منتخب کر کے اس کونشن میں شرکت کے لئے نامزد کریں۔

(۲) ان احباب کے اسمائے گرامی سے بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کو ذیل کے پتہ پر مطلع فرمائیں۔

(۳) ان احباب میں سے جو حضرات لاہور میں اپنے قیام کا انتظام خود نہ کر سکتے ہوں۔ ان کے متعلق اطلاع دی جائے تاکہ ان کے لئے مناسب انتظام کیا جا سکے۔

(۴) اس بنیادی سوال کے علاوہ (کہ قرآنی فکر کی عام نشر و اشاعت کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جائیں) اگر کوئی اور مسئلہ غور طلب سمجھا جائے تو اس سے بھی اطلاع دی جائے۔

اس مقصد عظیم کے لئے یہ پہلا اجتماع ہے جس کے انعقاد کی تجویز کی جا رہی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ بزم ہائے طلوعِ اسلام اس باب میں ہم سے پورا پورا تعاون کریں گی۔ والسلام۔

سکریٹری بزمِ طلوعِ اسلام

۴۴ - نسبت روڈ - لاہور

[**طلوعِ اسلام**:- بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا یہ فیصلہ مبارک ہے۔ ادارہ طلوعِ اسلام اس سعید مقصد کے حصول کے لئے ان سے پورا پورا تعاون کرے گا۔ اس سلسلہ میں ضروری اطلاعات طلوعِ اسلام کی ستمبر، اکتوبر اور نومبر کی اشاعتوں میں شائع ہوتی رہیں گی۔ بعض ایسے مقامات بھی ہیں جن میں ابھی تک طلوعِ اسلام کی بزمیں قائم نہیں ہوئیں۔ اگر ان مقامات میں بزمیں قائم کرلی جائیں تو ان کے نمائندے بھی اس مجوزہ کونشن میں شریک ہو سکیں گے۔ اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس کونشن کے سلسلہ میں تمام خط و کتابت براہِ راست سکریٹری بزمِ طلوعِ اسلام لاہور سے کی جائے۔ ادارہ طلوعِ اسلام سے نہ کی جائے۔]